ممبران کے لئے

میڈیا مانیٹر

مارچ۔اپریل 2009 نیوز لیٹر

پیمرا ریگولیشنز اور ٹی وی چینلز کی نشریات

پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی، جسے عرف عام میں پیمرا (PEMRA) کہا جاتا ہے، ایک سرکاری ادارہ ہے جس کے قیام کا مقصد ریڈیو اور ٹی وی چینلز اور کیبل نیٹ ورکس کے انفارمیشن، ایجوکیشن اور تفریح کے پروگراموں کے معیار کو بہتر بنانا ہے۔ پیمرا کی ویب سائٹ پر دیئے گئے پیمرا کے مینڈیٹ کے مطابق اس ادارے کا دوسرا اہم مقصد میڈیا میں خبروں، حالاتِ حاضرہ، مذہبی علم، آرٹ، کلچر، سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادی ترقی، سماجی شعبے کے مسائل، موسیقی، سپورٹس، ڈرامہ اور پبلک و قومی مفاد کے بارے میں دوسرے موضوعات پر پاکستان کے عوام کو میسر چوائس کو وسیع تر کرنا ہے۔

پیمرا کے قیام کے وقت چونکہ ملک میں جنرل پرویز مشرف کی حکمرانی تھی اور ہر طرف ''تفویض اختیارات'' (Devolution) کا شور بپا تھا چنانچہ پیمرا کے مینڈیٹ میں ''مقامی اور کمیونٹی کی سطح پر ابلاغ عامہ تک لوگوں کی رسائی کو بہتر بنا کر گراس روٹس تک تفویض اختیارات'' میں سہولت فراہم کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انفارمیشن کی آزادانہ فراہمی (Free flow of information) کے ذریعے احتساب، شفافیت اور گڈ گورننس کو یقینی بنانا تھا۔

پیمرا نے میڈیا براڈ کاسٹرز اور کیبل ٹی وی آپریٹرز کیلئے ''ضابطہ کار'' بھی مرتب کر رکھا ہے جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی ایسا پروگرام براڈ کاسٹ نہیں ہو گا جس میں:۔

- ☆ کوئی ایسی چیز شامل ہوگی جو ہتکِ عزت یا جانے بوجھے جھوٹے مواد پر مبنی ہوگی
- ☆ کوئی ایسا مواد شامل ہوگا جس سے تشدد پر اُکسانے کی حوصلہ افزائی کا امکان ہو، یا ایسے مواد پر مبنی ہو جو امن و امان کو برقرار رکھنے کے خلاف ہو یا، قوم دشمن یا ملک دشمن رویوں کو فروغ دیتا ہو۔
- ☆ ایسا مواد شامل ہو جو توہین عدالت پر مبنی ہے۔
- ☆ ایسا مواد جس کا مقصد کسی شخص کی ذات، یا کسی خاص گروہ، یا ملک کی سوشل، پبلک اور اخلاقی زندگی کے مختلف گروپوں کو بدنام کرنا ہو۔
- ☆ ایسا مواد جو پاکستان یا اس کے عوام کی توہین کا باعث ہو، یا جس کا مقصد ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے پاکستان کی سالمیت اور یک جہتی کو نقصان پہنچانا ہو۔
- ☆ ایسا مواد جو کسی بھی ایسے جرم میں اعانت کا باعث بنے جو تعزیراتِ پاکستان کے تحت قابل گرفت ہے۔
- ☆ ایسا مواد جو جرم یا مجرموں کی شان و شوکت کو بڑھانے (ہیرو بنانے) کا باعث بنے۔

اگر پیمرا کے مینڈیٹ اور براڈ کاسٹرز و آپریٹرز کیلئے مرتب کردہ ضابطہ کار کو سامنے رکھا جائے اور معروف ٹی وی چینلز کی نشریات کا جائزہ لیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ پیمرا کا مانیٹرنگ اور ریگولیٹری نظام انتہائی ناقص ہے۔ یا یہ کہ مینڈیٹ اور ضابطہ کار میں جن باتوں کا زور و شور سے ذکر کیا گیا ہے وہ محض دکھاوے کیلئے ہیں کیونکہ ہم کم از کم ٹی وی چینلز پر جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں وہ بر ملا اور واضح طور پر اس کے برعکس ہے جن کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مینڈیٹ میں پاکستان کے ''عوام'' کیلئے چوائس کو وسیع تر کرنے کی بات کی گئی ہے لیکن حقیقتاً ٹی وی چینلز مارکیٹ اور مخصوص خوشحال کنزیومر گروہ کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جبکہ عام آدمی اور اس کی زندگی ان چینلز کے پروگراموں کا موضوع شاید ہی بنتی ہے، پھر خبر، اطلاعات اور حالاتِ حاضرہ میں تنوع کہاں ہے؟ ایک ہی بات ہے منتخ بھر افراد جس کا صبح شام ورد کر رہے ہیں۔ ان پروگراموں میں ''عوام'' کہاں ہیں؟ یہ پروگرام کثیر الموضوعاتی اور کثیر الشرکتی (pluralistic) کیوں نہیں؟ پیمرا کو اپنے مینڈیٹ کا احترام کرنا چاہیے اور کمرشل اداروں کے مفادات کے تحفظ کی بجائے حقیقی معنوں میں عوام کیلئے ''وسیع تر چوائس'' کو یقینی بنانا چاہیے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک پیمرا کا وہ رویہ ہے جس کے تحت مخصوص نقطہ نظر کے حامل اینکر پرسنز کو طالبان اور ان کے لیڈروں کو ہیرو بنانے کی کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ مولانا صوفی محمد کی تقریر کو براہ راست نشر کیا گیا جس میں ملک، پارلیمنٹ اور آئین پاکستان کو کھلم کھلا تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ جو لوگ امن و امان کو تباہ کر رہے تھے اور کر رہے ہیں، جو لوگ ملک کی خودمختاری اور یک جہتی کو چیلنج کر رہے ہیں اور مادرِ وطن کے ایک حصے پر قبضہ جمارہے ہیں اور مسلح افواج پر حملے کر رہے ہیں، ان کے ترجمانوں کے براہ راست انٹرویو نشر کیے گئے، صبح شام ان کے بیانات جاری کیے گئے، پریس کانفرنسیں کی گئیں اور ٹی وی چینلز کی جانب سے ضابطہ کار کی مسلسل اور دیدہ دلیری سے خلاف ورزی کی گئی۔ غضب خدا کا، اس تمام صورت حال میں پیمرا کے افسران کہاں سوتے رہے ہیں!! اس سارے معاملے میں پیمرا اور اس کے ریگولیشن کہیں نظر نہیں آتے۔ پیمرا کے ذمہ دار افراد اگر ملک دشمن افراد کا قد کاٹھ بڑھانے اور ملک دشمن مواد نشر کرنے پر مصلحتاً چپ رہے ہیں تو حکومت اور وزارت اطلاعات کو اس کا سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے اور اگر ملک دشمن کارروائیوں کو دیدہ و دانستہ تقویت دینے کے ٹی وی چینلز کے ان اقدامات پر کوئی قانونی کارروائی کی جارہی ہے تو اسے عوام کے سامنے لانا چاہیے کیونکہ احتساب اور شفافیت تو پیمرا کے مینڈیٹ میں شامل ہے۔

(چیف ایڈیٹر)

اس شمارہ میں

اداریہ	1
ضابطہ اخلاق ضروری ہے	2
سیاست براستہ صحافت جنوبی ایشیاء میں	4
صحافیوں کی جان کو لاحق خطرات	5
میڈیا ایمپائر اور کارکنوں کی بدحالی	6
برطانوی اخبارات پر عوامی بے اعتمادی	6
اشتہارات کا ضابطہ اخلاق	7
وکلاء تحریک میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار	8
میڈیا اور سیاست	10
میڈیا میں نیاز، خان طالبان کی دھمکی	11
متاثرین باجوڑ اور پولیس میں تصادم	12
فلم ریویو: شوبز	13
میڈیا کارکن + عوام = میڈیا ڈیموکریسی	14
الیکٹرانک میڈیا: پاکستان میں مایوسی کی ایک وجہ	14
پاکستانی میڈیا کا تنقیدی جائزہ: سیمینار رپورٹ	15

سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ

(Society for Alternative Media and Research)

عوام پر مرکوز میڈیا کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ملک اور معاشرے میں سماجی تبدیلی اور انصاف کے علمبردار کچھ لوگوں نے اسلام آباد میں سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ (Society for Alternative Media and Research) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جو سوسائٹیز ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹرڈ ہے جس کا مقصد عوامی مسائل کے بارے میں عوامی نکتہ نظر کو مناسب انداز میں پیش کرنا ہے تاکہ وسیع البنیاد جمہوری مباحثے اور عمل کو فروغ ملے۔ اس گروپ میں عوامی حقوق کے سرگرم رکن، امن کے حامی، ماہرین، تحفظ ماحولیات کے کارکن، میڈیا اور صحافت سے وابستہ لوگ شامل ہیں جو ''مال کماؤ'' ایجنڈے پر عمل پیرا مقتدر میڈیا کو لوٹ مار میں ملوث حکمران طبقات کا حصہ سمجھتے ہیں۔

SAMAR کی رہنمائی ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا ہے جس کا یقین ہے کہ حقیقی علمی پس منظر کے بغیر میڈیا فوری اور مروّجہ کوتاہ نظری کا شکار ہو جاتا ہے اسے میڈیا کے متبادل تصور پر یقین رکھنے والے صحافیوں اور محققین کی ٹیم چلا رہی ہے جسے متبادل پرنٹ اور الیکٹرانک مواد کی تیاری کا تجربہ ہے۔

ایڈیٹوریل بورڈ: حارث خلیق، عبدالقادر، نبیلہ اسلم
چیف ایڈیٹر: مظہر عارف۔ ایڈیٹر: ارشد رضوی۔
پبلشر: سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ۔
پرنٹر: منزل پرنٹرز اسلام آباد

ضابطۂ اخلاق ضروری ھے

صحافت کے مسلمہ اصول اور ضابطۂ اخلاق اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ غیر مصدقہ ''اطلاعات'' یا سنی سنائی کہانیوں کو ''خبر'' کے طور پر اپنے قارئین، سامعین یا ناظرین تک پہنچایا جائے۔ اس قسم کی صحافت کو ''زرد صحافت'' کہا جاتا ہے اور یہ پریکٹس معاشرے میں بے یقینی، انتشار اور ضعیف الاعتقادی پھیلانے کا باعث بنتی ہے۔

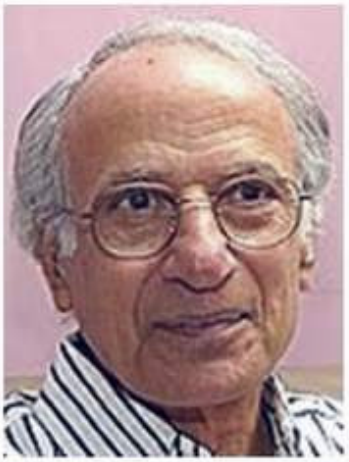

ڈاکٹر مہدی حسن

پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں ماضی قریب میں بہت بڑے نام ملتے ہیں جو صرف پیشہ ورانہ فرائض اور اپنی قابلیت ہی کی بنا پر نامور نہیں تھے بلکہ ان میں شامل تمام صحافی آزادئ اظہار کیلئے جدوجہد کے حوالے سے بھی جانے پہچانے ہیں، اور پاکستانی معاشرہ اور خصوصاً صحافی برادری، ان کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتی۔ ان نامور صحافیوں میں نثار عثمانی، ضمیر قریشی اور میر عبدالحق ایسے رپورٹر بھی تھے۔ ادارتی صفحوں کے ماہرین میں فیض احمد فیض، مظہر علی خان، احمد علی خان اور ظہیر بابر ایسے افراد شامل تھے۔ جبکہ یونین سرگرمیوں کے حوالے سے نثار عثمانی کے علاوہ عبداللہ ملک، اے ٹی ثریہ، چوہدری حمید ہاشمی، اشرف طاہر، کے جی مصطفیٰ (بنگلہ دیش) اور پی ایف یو جے کے بانی صفدر قریشی اور اسرار احمد (یہ دونوں بہ فضل خدا حیات ہیں اور ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں) کے نام بہت اہم ہیں۔ دو سب سے سینئر افراد ابھی بہ فضل خدا حیات ہیں۔ فوٹو گرافر ایف ای چوہدری اور کارٹونسٹ انور علی نے اپنے اپنے صحافتی فن میں بہت نام کمایا۔

آج سے چند سال پہلے تک اخبارات میں کالم نویسوں کی بھرمار برسات کی خودرو گھاس کی طرح نہیں ہوتی تھی، اخبار میں صرف ایک دو ہی کالم نویس ہوا کرتے تھے۔ اس شعبے میں ابراہیم جلیس مرحوم، صفدر میر مرحوم اور احمد ندیم قاسمی مرحوم ایسے نامور کالم نویس بھی شامل تھے۔ یہ تمام مرحوم صحافی یا اب ریٹائرڈ زندگی گزارنے والے صحافی پیشے کے لحاظ سے انتہائی قابل اور اپنے اپنے میدان کے شہسوار تھے لیکن ایک اور خوبصورت بات یہ بھی تھی کہ ان بہت بڑے صحافیوں نے کبھی خود کو 'سپر مین' سمجھ کر مراعات یافتہ افراد کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ ان میں سے تقریباً تمام افراد کی پوری مدت ملازمت جنرل ایوب خان، جنرل آغا محمد یحییٰ اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء ادوار پر محیط رہی اور ہر حاکم اور ہر حکومت ان سے ناراض رہی، انہیں خریدنے کی ناکام کوششیں بھی کی گئیں اور ڈرانے دھمکانے کے بھی بے شمار واقعات ہوئے۔ ان میں سے کئی نے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور متعدد بار نوکریوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

> سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اخبارات اور نوزائیدہ ٹیلی ویژن صحافت سے 'گیٹ کیپر' کا کردار مکمل طور پر مفقود ہو چکا ہے، نہ اخبارات میں کوئی نو وارد صحافیوں کو گائیڈ کرنے والا موجود ہے اور نہ ہی بعض انتہائی قابل اعتراض تحریروں پر کوئی روک ٹوک کا اندرونی نظام قائم ہے۔

ایک ٹیلی ویژن چینل پر ایک ریٹائرڈ جرنیل وزیر کی موجودگی میں جامعہ حفصہ کی دو طالبات نے یہ بیان دیا کہ انہوں نے محاسرے کے دوران ایک رات میں ایک سو اسی طالبات اور مجاہد بھائیوں کو مدرسہ اور مسجد میں دفنایا۔ انہوں نے یہ دل دہلانے والی تصویر کشی بھی کی کہ ہمارے ہاتھ اور کپڑے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ پروگرام کے کمپیئر یا جرنیل وفاقی وزیر نے ان خواتین سے یہ نہیں پوچھا کہ ایک رات میں ایک سو اسی افراد کو بغیر کسی ساز و سامان کے دفن کرنا وہ بھی ایسے کمپلیکس میں جس میں نہ صرف انتظامیہ بہت جلد داخل ہو گئی بلکہ کچھ عرصے بعد عام شہری بھی وہاں آنے جانے لگے تھے، خفیہ یا راز تو نہیں رہ سکتا۔

ان میں سے چند کے پاس چھوٹی چھوٹی کاریں تھیں مگر کسی کار پر 'پریس' کی تختی نہیں لگی ہوتی تھی، باقی اکثریت رکشہ اور ٹیکسی سوار تھی۔

یہ تمام صحافی باوجود تمام پابندیوں اور سختیوں کے، موقع ملنے پر بہت بے رحمی کے ساتھ حکومت اور اپوزیشن دونوں پر تنقید کرتے تھے۔ اپنے نظریاتی مخالفین پر فقرے بھی کستے تھے اور طنز و مزاح کے کالموں میں ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے لیکن انہوں نے کبھی بدزبانی نہیں کی اور پریس کانفرنسوں اور انٹرویوز میں کبھی کسی سے بدتمیزی نہیں کی۔ ان کی تحریروں اور ان کی پیشہ وارانہ زندگی میں لفظ ''میں'' کا کوئی استعمال نہیں تھا۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ان صحافیوں کے دور میں تمام صحافت اور صحافی پاک صاف تھے۔ اس وقت بھی گالم گلوچ کرنے والے اور بلیک میلر میدان میں موجود تھے لیکن ان اخبارات اور رسالوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اور ان کی تحریروں کو کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔

آج کے دور میں جب اخبارات کے وسائل میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے، مالکان ارب پتی اور اخبار نویس لکھ پتی اور بعض صورتوں میں کروڑ پتی کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں، صحافت کی وہ صحت مند روایات ختم ہو گئی ہیں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اخبارات اور نوزائیدہ ٹیلی ویژن صحافت سے 'گیٹ کیپر' کا کردار مکمل طور پر مفقود ہو چکا ہے، نہ اخبارات میں کوئی نو وارد صحافیوں کو گائیڈ کرنے والا موجود ہے اور نہ ہی بعض انتہائی قابل اعتراض تحریروں پر کوئی روک ٹوک کا اندرونی نظام قائم ہے۔ چنانچہ آج کا ہر کالم 'میں' سے شروع ہو کر 'میں' پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بزعم خود بہت بڑے کالم نویس اپنی صحت کی رپورٹ اور اپنے لئے ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخے بھی اپنے کالم کی زینت بنا دیتے ہیں۔ بہت ہی بڑے کالم نویس کا کالم یوں بھی شروع ہو جاتا ہے کہ ''کل میری صدر صاحب سے ان کی خواہش پر ملاقات ہوئی تو'' ایسے کالم بھی روزانہ شائع ہوتے ہیں کہ ''مجھے بچپن کی ملیاں میں اسلامی فلاحی سکول میں چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا اور میری خدمت میں یہ سپاسنامہ پیش کیا گیا... اور اس کے بعد سپاسنامہ کا پورا متن کالم میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

لاہور کے ایک نظریاتی اخبار میں روزانہ شائع ہونے والے فکاہی کالم میں کسی معزز کالم نویس نے پنجابی کانفرنس کے صدر فخر زمان پر بھرپور تنقید کی جس کا لکھنے والے کو پورا حق حاصل تھا لیکن انہوں نے چھ سات مرتبہ فخر زمان کے نام کو 'خر زمان' لکھا۔ اس کو نہ تو ایڈیٹر صاحب نے دیکھا اور نہ ہی کسی سب ایڈیٹر، پروف ریڈر نے اس کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ اسی طرح لاہور کے ایک کثیر الاشاعت اخبار جس کا دعویٰ ہے کہ ''ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہماری کوئی پالیسی نہیں'' میں ایک بہت لاڈلے کارکن، جو اسی ادارے کے ٹیلی ویژن چینل پر مذہبی پروگرام بھی کرتے ہیں، نے اسی ہفتے کے دوران ڈنمارک پر دو کالم تحریر کئے ہیں۔ آج کل ڈنمارک سے تمام مسلمان

ممالک بہت زیادہ ناراض ہیں کیونکہ اس ایک ہالشت کے ملک کے ایک اخبار نے دوسری بار ایسے گستاخ خاکے شائع کئے ہیں جو مذہبی عقیدے سے قطع نظر اخلاقی لحاظ سے بھی اشاعت کیلئے قابل مذمت ہے۔ جب پہلی بار یہ گستاخ خاکے شائع ہوئے تھے تو لاہور کے مسلمانوں نے اس گستاخی کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے مسلمان شہریوں کے ٹوٹے موٹر سائیکل، تیس کے قریب کاریں، بینکوں کی چند برانچیں اور مال روڈ پر ایک تاریخی اہمیت کا حامل ریسٹورنٹ نذر آتش کر دیا تھا۔ الحمدللہ آج کل ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں مسلمانوں کی پراپرٹی کو نشانہ نہیں بنایا گیا۔ کثیر الاشاعت

اخبار کے اس کالم نویس نے چار دن کے دوران دو کالموں میں ایک درجن مرتبہ حرامزادے، حرامی، حرام کاری، بغیر باپ کی اولاد'' اور متعدد ایسے ہی بہت سے تحقیقی مواد سے قارئین کو نوازا ہے، یقیناً یہ کالم کراچی، راولپنڈی اور لاہور کے اسی اخبار میں بہت سے سینئر اخبار نویسوں کی نظر سے بھی گذرا ہوگا، کیا کسی نے کالم نویس سے یہ پوچھا کہ اداریتی صفحے پر چھپنے والے اس کالم میں کونسی زبان استعمال ہو رہی ہے؟

گیٹ کیپنگ'' کی یہ کمی صرف مطبوعہ صحافت تک محدود نہیں ہے بلکہ نوزائیدہ ٹیلی ویژن صحافت میں توازن اور ضابطۂ اخلاق کے فقدان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کیونکہ آج کل پرائیویٹ چینلز بڑی تیزی سے وجود میں آ رہے ہیں اور آپس میں مقابلے کے رجحان کی وجہ سے اکثر چینلز 'زرد صحافت' کا شکار ہو رہے ہیں کیونکہ فوری طور پر اتنی بڑی تعداد میں تربیت یافتہ براڈ کاسٹ کے ماہر صحافی میسر نہیں ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کی صحافت ایک سزا یافتہ غیر ملکی جاسوس کی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر رہائی کو اس انداز سے رپورٹ کرتی ہے کہ سزا یافتہ دشمن جاسوس ایک ہیرو، ایک وی آئی پی اور ایک مظلوم شخص نظر آتا ہے، اس سارے غیر ضروری ڈرامے میں متوازن رپورٹنگ سرے سے مفقود تھی۔ اس قسم کی کوریج لال مسجد کے فوجی ایکشن اور وکلاء اور معزز جج صاحبان کے جلسے اور جلوس کے دوران بھی دیکھنے میں آئی۔ آنسو گیس کی اطلاع دینے والا رپورٹر کھانس رہا ہوتا ہے، اس کی سانس رکتی محسوس ہوتی ہے اور نیوز اینکر اس سے کہتا ہے'' اپنا خیال رکھیں، اپنی جان کی حفاظت کریں۔'' اس قسم کی رپورٹنگ دنیا میں کہیں اور نہیں

> **انہوں نے کبھی بدزبانی نہیں کی اور پریس کانفرنسوں اور انٹرویوز میں کبھی کسی سے بدتمیزی نہیں کی۔ ان کی تحریروں اور ان کی پیشہ وارانہ زندگی میں لفظ ''میں'' کا کوئی استعمال نہیں تھا۔**

ایک ٹیلی ویژن چینل پر ایک ریٹائرڈ جرنیل وزیر کی موجودگی میں جامعہ حفصہ کی دو طالبات نے یہ بیان دیا کہ انہوں نے محاصرے کے دوران ایک رات میں ایک سو اسی طالبات اور مجاہد بھائیوں کو مدرسہ اور مسجد میں دفنایا۔ انہوں نے یہ دل دہلانے والی تصویر کشی بھی کی کہ ہمارے ہاتھ اور کپڑے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ پروگرام کے کمپیئر یا جرنیل وفاقی وزیر نے ان خواتین سے یہ نہیں پوچھا کہ ایک رات میں ایک سو اسی افراد کو بغیر کسی ساز و سامان کے دفن کرنا وہ بھی ایسے کمپلیکس میں جس میں نہ صرف انتظامیہ بہت جلد داخل ہو گئی بلکہ کچھ عرصے بعد عام شہری بھی وہاں آنے جانے لگے تھے، خفیہ یا راز تو نہیں رہ سکتا۔ کیا وہاں پر ایک سو اسی قبریں اب موجود ہیں اور تدفین کیلئے یا تو بلڈوزر کی ضرورت پڑے گی یا بہت زیادہ افراد کے پاس کدالیں اور کسیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر لال مسجد کمپلیکس میں اتنی بڑی تعداد میں تازہ قبریں یا اجتماعی قبر موجود ہے تو یہ میڈیا کیلئے انتہائی اہم اور ضروری

> **ان میں سے تقریباً تمام افراد کی پوری مدت ملازمت جنرل ایوب خان، جنرل آغا محمد یحییٰ اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء ادوار پر محیط رہی اور ہر حاکم اور ہر حکومت ان سے ناراض رہی، انہیں خریدنے کی ناکام کوششیں بھی کی گئیں اور ڈرانے دھمکانے کے بھی بے شمار واقعات ہوئے۔ ان میں سے کئی نے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور متعدد بار نوکریوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ان میں سے چند کے پاس چھوٹی چھوٹی کاریں تھیں مگر کسی کار پر 'پریس' کی تختی نہیں لگی ہوتی تھی، باقی اکثریت رکشہ اور ٹیکسی سوار تھی۔**

ہوتی۔ ٹیلی ویژن اور اخباری رپورٹروں نے ویتنام میں، 11 ستمبر کو نیویارک میں اور عراق اور افغانستان کی جنگ میں براہ راست رپورٹنگ کر کے ساری دنیا کو خبریں دی ہیں مگر ہم نے ٹیلی ویژن سکرین پر کسی رپورٹر کو گولی سے بچنے کیلئے بولتے بولتے نیچے دبکتے نہیں دیکھا۔

ٹیلی ویژن صحافت میں اتنے اضافے کے بعد یہ اشد ضروری ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے صحافی مل بیٹھ کر اپنے لئے ایک ضابطۂ اخلاق تیار کریں تاکہ اس کے بعد حکومت سے یہ مطالبہ کیا جا سکے کہ اس ضابطۂ اخلاق کے بعد آزادئ اظہار کو پابند کرنے والے کسی قسم کے قوانین غیر ضروری ہیں لہٰذا انہیں ختم کیا جائے۔

خبر ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس خبر کو نشر کیا گیا اور اخبارات نے مائیٹرنگ ڈیسک کے حوالے سے اسے شائع بھی کیا تاہم کسی رپورٹر نے اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایک ایسی ہی خبر جماعت اسلامی کے لیڈر لیاقت بلوچ کے بیان کی شکل میں شائع ہوئی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ لال مسجد آپریشن میں ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ نہ تو لیاقت بلوچ صاحب نے یہ دعویٰ کرنے سے پہلے تصدیق کی ضرورت محسوس کی نہ ہی کسی رپورٹر نے ان سے ثبوت طلب کیا، تاہم ایک ہزار ہلاکتوں کی خبر سارے ملک کو پہنچا دی گئی۔

حال ہی میں بعض اخبارات میں ایک خبر یہ شائع ہوئی ہے کہ لال مسجد کے آپریشن میں جاں بحق ہونے والوں کی قبروں سے اتنی خوشبو آ رہی ہے کہ سارا قبرستان مہک رہا ہے۔ ایک ایسی ہی 'خبر' میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان قبروں میں سے تلاوت کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک اور 'خبر' میں قارئین کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی صفائی کے بعد جو ملبہ قریبی نالے میں پھینکا گیا ہے اس میں انسانی جسموں کے اتنے ٹوٹے شامل تھے کہ تمام علاقے میں تعفن پھیل گیا ہے۔ اس خبر کی اشاعت کے بعد حکام نے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں انہیں کوئی انسانی گوشت دستیاب نہیں ہو سکا۔ یہ تینوں ''خبریں'' بغیر تحقیق اور بغیر کسی ثبوت کے سنی سنائی کہانیوں پر مبنی ہیں جنہیں ''افواہ'' کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

افواہ کی باقاعدہ نفسیات ہے۔ افواہیں اس وقت پھیلتی ہیں جب کسی ایسے اہم موضوع پر کثیر تعداد میں لوگوں کو مکمل معلومات میسر نہ ہوں جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ مکمل معلومات کے حصول میں یہ ناکامی انسانوں کی اپنی پیدا کی ہوئی رکاوٹوں مثلاً سنسر شپ یا میڈیا کی آزادی سلب کرنا، کی وجہ سے ہو سکتی ہے یا قدرتی آفات مثلاً طوفان، سیلاب یا زلزلہ وغیرہ کی وجہ سے ذرائع ابلاغ کی راہیں مسدود ہونے سے بھی ہو سکتی ہیں، اس لئے جنگ اور قدرتی آفات کے موقعوں پر بہت سی افواہیں پھیل جاتی ہیں۔ جن معاشروں میں حکومت ذرائع ابلاغ کو پابند رکھتی ہیں وہاں ہمیشہ افواہیں پھیلتی رہتی ہیں، پاکستان میں ایوب خان اور ضیاء الحق کے ادوار میں ہر قسم کی افواہیں عام تھیں۔ مشرقی پاکستان کے بحران میں کیونکہ عوام کو کسی قسم کی اطلاعات دستیاب نہیں تھیں اس لئے حکومت اور جماعت اسلامی کی طرف سے دی ہوئی مصلحت آمیز اطلاعات بے شمار افواہوں کا سبب بنی تھیں۔

ماہرین نفسیات کے مطابق افواہیں تین قسم کی ہو سکتی ہیں۔ ایسی مصدقہ 'اطلاعات' جو خوش فہمی پر مبنی ہوں، لوگ انہیں فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ ایسی 'اطلاعات' جن سے سننے والوں کے خوف اور تشویش کا اظہار ہو، وہ غیر مصدقہ اطلاعات بھی تیزی سے پھیل جاتی ہیں اور تیسری قسم ایسی 'اطلاعات' کی ہوتی ہے جس سے کسی غیر پسندیدہ شخصیت، ادارے یا نظریے پر تنقید ہو یا نفرت کا اظہار ہوتا ہو، بہت آسانی سے گردش کرنے لگتی ہیں۔

صحافت کے مسلمہ اصول اور ضابطۂ اخلاق اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ غیر مصدقہ ''اطلاعات'' یا سنی سنائی کہانیوں کو ''خبر'' کے طور پر اپنے قارئین، سامعین یا ناظرین تک پہنچایا جائے۔ اس قسم کی صحافت کو ''زرد صحافت'' کہا جاتا ہے اور یہ پریکٹس معاشرے میں بے یقینی، انتشار اور ضعیف الاعتقادی پھیلانے کا باعث بنتی ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی)

سیاست براستہ صحافت

ارشد رضوی

لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'نیا زمانہ' کے شمارہ اپریل 2009 میں ایک قاری عمر فاروق کا ایک خط شائع ہوا ہے، جس میں موصوف لکھتے ہیں "میڈیا اور اس سے منسلک افراد بالخصوص اینکرز اور کالم نگار حضرات اتنے مضبوط اور طاقتور (منفی معنوں میں) ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی ان پر تنقید اور ان کے رویوں پر گرفت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" اپنے مکتوب میں وہ مزید لکھتے ہیں "اب بعض کالم نگاروں اور صحافیوں نے براہ راست (سیاسی جماعتوں اور سیاسی شخصیات کے مخصوص نقطہ نظر کی ترویج و اشاعت کے علاوہ) سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ سیاست میں حصہ لینا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں ہے لیکن عملی سیاست دان بن کر انہیں کالم نگاری ضرور ترک کر دینی چاہیے تاکہ ان کی غیر جانبداری پر حرف نہ آئے۔" موصوف نے اپنے مکتوب میں بالخصوص ایاز امیر کا ذکر کیا ہے جو کالم نگاری کے ساتھ ساتھ باقاعدہ سیاست کر رہے ہیں، وہ ایک سیاسی جماعت کے ٹکٹ پر ایک بار ممبر صوبائی اسمبلی اور دوسری بار ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عمر فاروق نے اپنے مکتوب کی وساطت سے ایک اہم مسئلے کی طرف ہم سب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز کے ناظرین اور اخبار بین ایک گروپ آف 'دانشوراں' کے چنگل میں ہیں، یہی دانشور اور قلم کار ٹی وی چینلز پر بطور اینکر اور بحیثیت کالم نگار اخبارات کے صفحات پر اپنے مخصوص افکار و نظریات کی ترویج و پرچار میں دن رات جٹے ہوئے ہیں۔ یہ اینکر پرسن و کالم نگار یا اپنے تئیں سیاسی، سماجی، معاشی و دفاعی تجزیہ کار صرف اینکر یا کالم نگار ہی نہیں ہیں، یہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مہمانوں کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے کی مہارت بھی رکھتے ہیں اور اگر کوئی مہمان ایسا ماننے سے انکار کرتا ہوا نظر آئے تو یہ 'دانشور' بات کو ادھورا چھوڑ کر بات کا رخ بدلنے کا اختیار بھی رکھتے ہیں۔ ٹی وی چینلز اور انگریزی و اردو اخبارات کی طویل فہرست کے باوجود پاکستان کے عوام جن دانشوروں کے نرغے میں دن رات پھنسے رہتے ہیں ان کی فہرست بہت مختصر ہے۔ ان عالمان سیاست و معیشت اور سماجیات و دفاع کے نمایاں ترین نام زیادہ سے زیادہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں پر گنے جا سکتے ہیں۔ گویا فہم و ادراک میں بھی پاکستان 'خط غربت' سے نیچے ہی ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر ان خواتین و حضرات کا ذکر ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ ہو جائے: خواتین میں نسیم زہرہ اور شیریں مزاری (ان دو خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی ایک سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے)، مرد حضرات میں حامد میر، ڈاکٹر شاہد مسعود، طلعت حسین، ایاز امیر، عباس اطہر، عبدالقادر حسن، ہارون رشید، مجیب الرحمان شامی، جاوید چوہدری، ... یہ ہمارے وہ کالم نگار اور اینکرز ہیں جن کے کالم اور ٹاک شوز کے 'حلقہ اثر' میں پورا پاکستان ہے۔ آپ اخبار دیکھیں انہی کے کالم، ٹی وی آن کریں ان ہی کے روشن روشن چہرے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ گو یہ تمام خواتین و حضرات مختلف اخبارات اور ٹی وی چینلز سے منسلک ہیں مگر حسن اتفاق ہے کہ (کم و بیش) ان سب کی اپروچ، نقطہ نظر، تجزیہ اور حاصل گفتگو ایک ہی نکتے پر منتج ہوتا ہے۔ مسئلہ لال مسجد کا ہو یا عدلیہ بحالی کا، حکومت کی کارکردگی کا جائزہ ہو یا دہشت گردی کے خلاف جنگ کا، سب کالم نگار اور اینکر پرسن کم و بیش ایک جیسی اپروچ رکھتے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے یا سوچ کے سوتے کہیں ایک ہی سلسلہ، کو سے پھوٹتے ہیں، جو بھی ہو مگر یہ سچ ہے کہ انہوں نے عام شہری کے نظریات و افکار کو یرغمال بنا رکھا ہے۔

بالعموم جو اینکر پرسن جس ٹی وی چینل پر نظر آتا ہے اسی گروپ کے اخبار میں اس کا کالم بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ صحافی لوگ دو دو تنخواہوں کا مزہ لے رہے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو مقام شکر ہے کہ صحافی برادری میں ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جسے 'خوشحال' کہا جا سکتا ہے، یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر دو صورتیں ہونگی۔ ایک یہ کہ دو جگہ کام کرنے کے باوجود یہ محض ایک تنخواہ پر کام کر رہے ہیں جو ایک طرح سے استحصال ہے۔ ایسی صورت میں ان خواتین و حضرات کے ساتھ ہم پوری پوری ہمدردی کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ میڈیا صنعت (پرنٹ و الیکٹرانک) کے مالکان اتنے بااثر اور طاقتور ہیں کہ اس شعبے کی تمام تنظیموں کی تاریخی جدوجہد اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے باوجود کوئی حکومت ان کو ویج بورڈ ایوارڈ کے مطابق معاوضہ دلوانے کی قوت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی ہے۔ اور اگر یہ لوگ ایک تنخواہ پر دوسرا کام رضاکارانہ طور پر کر رہے ہیں تو ان کی عظمت کو ہمارا اسلام عقیدت۔

ایک ٹاک شو جس میں عموماً چار بہت سینئر صحافی شریک گفتگو ہوتے ہیں مگر اس پروگرام کا مقصد کیا ہے، آج تک واضح نہیں ہو سکا، دوسرے اس پروگرام کی پیش کش میں سنجیدگی کا عنصر تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح نصرت جاوید اور مشتاق منہاس کا پروگرام اور معروف آرٹسٹ سہیل احمد کا ایک پروگرام دیکھ کر شادی بیاہ کے موقع پر دو ذہین و فطین فنکاروں کی پُر لطف گفتگو یاد آ جاتی ہے۔ ان کے پروگراموں کا عام آدمی پر کوئی مثبت اور تعمیری تاثر کیسے پڑ سکتا ہے۔ پاکستان آج جن مسائل و حالات کا شکار ہے ان سے ہر پاکستانی واقف و آگاہ ہے۔ میڈیا سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ حالات کی رپورٹنگ اور تصویر کشی کرتے ہوئے سنجیدگی اور انتہائی ذمہ داری سے کام لے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ میڈیا کا غیر جانبدار ہونا خود میڈیا کی قبولیت کیلئے ضروری ہے، مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔

ٹی وی چینلز اور اخبارات کی اس روش سے لوگوں میں بیزاری اور ڈپریشن بڑھ رہا ہے اور وہ میڈیا سے نالاں ہو رہے ہیں جو کہ مستقبل کے حوالے سے ایک خطرناک صورت ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ نہ صرف اس کھیل کے کھلاڑی اس طرز صحافت پر غور کریں بلکہ میڈیا مالکان کو بھی، اگر وہ خود اس کھیل کا حصہ نہیں ہیں، اس طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جنوبی اشیاء میں صحافیوں کی جان کو لاحق خطرات

بینا سرور

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ کے ماہ مارچ میں فیصل آباد میں منعقدہ اجلاس میں جو اہم مسئلہ درپیش تھا وہ پاکستان میں صحافیوں کی زندگی کے لئے بڑھتے ہوئے خطرات ہیں۔ 26 مارچ کو راولپنڈی میں ایک اور صحافی کے قتل نے صورت حال کی سنگینی میں اور اضافہ کر دیا۔ نامعلوم قاتلوں نے روزنامہ ''نیشن'' اور''وقت''ٹی وی چینل کے رپورٹر رضیہ اسد حیات کو اس وقت گولی ماردی جب وہ شام کو گھر پہنچ کر اپنی کار کھڑی کر رہے تھے۔

اس سال کے شروع سے اب تک یہ تیسرے صحافی کا قتل تھا۔ تین روز قبل 23 مارچ کو لاہور میں ڈان نیوز ٹی وی کے نوجوان رپورٹر طارق ملک کو اس وقت چاقو گھونپ کر اور پھر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جب وہ بظاہر موبائل فون چھیننے کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔ ماہ فروری میں '' دی نیوز'' اور جیو ٹی وی کے نامہ نگار موسیٰ خانخیل کو وادی سوات میں اغوا کر کے اس وقت قتل کر دیا گیا جب حکومت اور صوفی محمد کے درمیان امن معاہدہ طے پا رہا تھا۔ اسلام آباد کے سینئر صحافی سی آر شمسی نے آئی پی ایس کو بتایا کہ'' اس وقت ہمارے سامنے یہ اہم مسئلہ ہے۔ ہم پہلے ہی معاشی قتل کا سامنا کر رہے ہیں کیونکہ میڈیا مالکان نے ابھی تک ساتویں ویج بورڈ پر عمل درآمد نہیں کیا۔ اب ہماری رپورٹنگ کی وجہ سے ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ گئیں ہیں۔ ہمیں لائف انشورنس مہیا نہیں کی گئی، حالات جنگ میں رپورٹنگ کی کوئی تربیت نہیں دی گئی اور نہ ہی کوئی ڈیفنس کٹ یا زندگی بچانے کا دوسرا کوئی میٹریل دیا گیا ہے جیسا کہ بین الاقوامی میڈیا کے صحافیوں یا یورپی صحافیوں کو میسر ہے۔''

سی آر شمسی کا کہنا تھا کہ گذشتہ چند برسوں کے دوران پرائیویٹ ٹی وی چینلز جس تعداد میں نمودار ہوئے ہیں، اس سے میڈیا '' سیاسی کھلاڑیوں کے مابین لڑائی میں ایک فریق بن گیا ہے۔'' بہت سے مبصرین نے میڈیا کے اس سرگرم رول پر تبصرے کئے ہیں۔ ممتاز تجزیہ نگار عرفان حسین نے روزنامہ ڈان میں اپنے ایک حالیہ کالم میں اس پر تبصرہ کیا ہے کہ میڈیا '' کس حد تک پاکستانی سیاست اور سوسائٹی میں ایک فعال کھلاڑی بن چکا ہے۔ انہوں نے اپنا نقطہ نظر صحیح ثابت کرنے کے لئے کئی مثالیں دیں اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک نجات دلانے والی قوت (Liberating force) بننے کی بجائے، جیسا کہ بہت سے لوگوں نے امیدیں وابستہ کر رکھیں تھیں، پرائیویٹ ٹی وی چینلوں نے اس کے برعکس موجودہ تعصبات کو ہوا دے کر تعصبوں کو چیلنج کرنے کی بجائے، ان کے مقاصد پورے کرنے کا کام کیا ہے۔ چینلوں کے مالکان کا اپنا پوشیدہ ایجنڈا ہے جبکہ نیم تعلیم یافتہ پروڈیوسرز اور اینکرز آراء کو حقائق سے الگ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔''

دریں اثناء صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی Committee to Protect Journalists (CPJ) نے اپنی Impunity Index 2009 رپورٹ میں پاکستان کو صحافیوں کے لئے خطرات کے ضمن میں دسویں نمبر پر رکھا ہے۔ یہ رپورٹ ان ملکوں کے بارے میں ہے جہاں حکومتیں صحافیوں کے قتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہیں۔ سی پی جے کے مطابق جو صحافی پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران موت کا شکار ہوئے ہیں ان میں سے 70 فیصد سے زائد کو قتل کیا گیا ہے۔ انڈیکس میں ان صحافیوں کو شامل نہیں کیا گیا جو جنگ یا پرتشدد احتجاجی مظاہروں کے دوران موت کا شکار ہوئے ہیں۔ اس انڈیکس میں 1999 سے 2008 تک تمام ملکوں میں ان صحافیوں کے قتل کے بارے میں ہے جن کے قتل کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ رپورٹ میں صرف ان ملکوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں پانچ یا اس سے زائد صحافیوں کے قتل کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ اس کیٹگری کے تحت 2008 کی رپورٹ میں 14 ملکوں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ 23 مارچ کو منیلا (فلپائن) میں فلپائنی کالم نگار مارلینے گا شیا کے قتل کی چوتھی برسی کے موقع پر شائع کی گئی جس نے حکومت کے زرعی محکمے میں کرپشن کو بے نقاب کیا تھا۔ اسے اپنے گھر میں اپنے افراد خانہ کے سامنے گولی ماری گئی۔ سی پی جے کی کمپین کوآرڈینیٹر ایلزبتھ وشیل کے مطابق فلپائنی صحافی ملک میں دو درجن صحافیوں کے قتل کا سراغ لگانے اور قاتلوں کو سزا دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ حکومت سے صحافیوں کے تحفظ کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں۔ انڈیکس رپورٹ میں عراق، سیرالیون اور صومالیہ صحافیوں کے قتل کا سراغ لگانے میں ناکامی پر بالترتیب پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں۔ تاہم رپورٹ میں'' سری لنکا اور پاکستان جیسے ممالک میں بگڑی ہوئی صورت حال'' کا خصوصی نوٹس لیا گیا ہے۔ فہرست میں دوسرے ممالک میں سری لنکا (4)، کولمبیا (5)، فلپائن (6)، افغانستان (7)، نیپال (8) اور روس (9) شامل ہیں۔

بھارت اس سلسلے میں 14 نمبر پر ہے جہاں آسام کے دارالحکومت گوہاٹی میں اسی ماہ روزنامہ'' آجی'' کے ایڈیٹر انیل ماجمدار کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ گذشتہ نومبر میں آسام کے ایک اور صحافی جگجیت سائیکیا کو قریب سے گولی ماردی گئی۔ سائیکیا ایک مقامی روزنامہ کے ضلعی نامہ نگار تھے۔ نومبر ہی میں منی پور کے دارالحکومت امپھل میں ''امپھل فری پریس'' کے سب ایڈیٹر کونسام رشی کانتا کو قتل کیا گیا جس کے خلاف احتجاجاً امپھل میں ایک روز اخبارات شائع نہیں ہوئے۔ سی پی جے کے مطابق منی پور میں صحافی مقامی باغی گروپوں اور حکومت دونوں جانب سے دباؤ کا شکار ہیں۔ جنگ زدہ علاقوں میں صحافیوں کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سی پی جے کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جوئیل سائمن نے رپورٹ میں کہا کہ صحافیوں کے قتل کا سراغ لگانے میں ناکامی سے پریس کے خلاف تشدد اور بڑھتا ہے۔ جنوبی اشیاء کے صحافیوں کو شدید خطرات کا سامنا ہے کیونکہ انڈیکس رپورٹ میں شامل 14 ممالک میں سے چھ ملک سری لنکا، افغانستان، نیپال، بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت جنوبی ایشیائی ممالک ہیں۔ گذشتہ چند ماہ میں اس ریجن میں معروف صحافیوں کے خوفناک قتل ہوئے ہیں جن میں 8 جنوری کو کولمبو میں '' دی سنڈے لیڈر'' کے ایڈیٹر انچیف لاسانتھا وکرما تنگے کا قتل بھی شامل ہے۔ اس کے تین روز بعد نیپال کے جنوبی ضلع جنک پور میں پرنٹ اور ریڈیو رپورٹر 27 سالہ اوما سنگھ کو پندرہ حملہ آوروں نے اس کے گھر میں گھس کر خنجر سے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ رپورٹ میں مطابق جنگ کے دنوں میں بھی ان صحافیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو لڑائی کے دوران ہلاک ہونے کی بجائے قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر قتل ہونے والے صحافیوں کی تعداد تمام میڈیا ہلاکتوں کا دو تہائی ہے عالمی سطح پر قتل ہونے والے صحافیوں کی اکثریت مقامی رپورٹروں کی ہے جو اپنے ملک میں جرائم، کرپشن اور نیشنل سیکورٹی جیسے حساس موضوعات پر رپورٹنگ کرتے ہیں۔

(آئی ایس پی۔ترجمہ)

میڈیا ایمپائر اور کارکنوں کی بدحالی

ماہ اپریل میں دو دلچسپ خبریں روزنامہ ڈان کی زینت بنی ہیں۔ 3 اپریل کو شائع ہونے والی خبر میں بتایا گیا ہے کہ راولپنڈی/اسلام آباد یونین آف جرنلسٹ کے عہدیداروں اور ارکان نے ڈان آفس کے باہر کارکنوں کی برطرفی کے خلاف مظاہرہ کیا اور ان کارکنوں کی بحالی کا مطالبہ کیا جنہیں ڈان نیوز ٹی وی چینل سے فالتو قرار دے کر فارغ کر دیا گیا ہے۔ ڈان نیوز کے بعض ان کارکنوں نے بھی مظاہرے میں شرکت کی جنہیں فارغ کر دیا گیا ہے۔ آر آئی یو جے کے جنرل سیکریٹری بلال قطبیم نے، جو خود ایک اخباری ادارے سے برطرف ہو چکے ہیں، خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صرف ڈان نیوز سے ہی نہیں بلکہ گذشتہ چند ماہ کے دوران جیو، اے آر وائی اور آج سمیت متعدد ٹی وی چینلز سے سینکڑوں صحافیوں کو برطرف کیا جا چکا ہے۔ بڑے پیمانے پر ٹی وی چینلز سے صحافیوں کی برطرفی بلاشبہ افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ لیکن شاید ایسا ہونا ہی تھا۔

سینیئر صحافی فاروق سلہریا نے تقریباً دو ماہ قبل اپنی ویب سائٹ laborpakistan.org پر اخباری دنیا میں بحران کے بارے میں انکشاف کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ -- کھمبیوں کی طرح نجی ٹی وی چینلز کی پیدائش نے صحافیوں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ جنرل مشرف کو میڈیا کی آزادی کا کریڈٹ لینا چاہیے کیونکہ زیادہ تر نجی ٹی وی چینلز ان کے دور میں شروع کئے گئے۔ اس وقت چالیس کے قریب چینلز ہیں جن میں پانچ مذہبی پروگراموں پر مبنی ہیں۔ تاہم اس بحث کو ابھی چھوڑتے ہیں کہ جنرل مشرف کے دور میں اتنے ٹی وی چینلز کیوں شروع کئے گئے۔

سب کچھ گذشتہ پانچ برسوں میں تبدیل ہوا۔ صحافیوں کو اگر اچھا جاب نہیں تو اچھا معاوضہ ضرور ملا۔ پریس کلبوں کی ممبر شپ کئی گنا بڑھ گئی۔ انگریزی ماہنامہ نے تقریباً دو سال قبل دعویٰ کیا کہ نئے ٹی وی چینلز نے چالیس ہزار لوگوں کیلئے جاب کے مواقع پیدا کئے۔ تاہم یہ پیش گوئیاں صحیح ثابت نہ ہو سکیں۔ مالکان نے جیو انگلش کا پروجیکٹ ختم کر دیا ہے اور جیو اردو میں بھی چھانٹیاں کی جا رہی ہیں۔ فاروق سلہریا لکھتے ہیں کہ روزنامہ خبریں میں تین ماہ سے تنخواہ ادا نہیں کی گئی جبکہ انگریزی اخبار ''پوسٹ'' سے کئی کارکنوں کو فارغ کر دیا گیا ہے۔ روزنامہ وقت جنگ گروپ نے خرید لیا ہے۔ ڈیلی ٹائمز اور روزنامہ ''آج کل'' سے بھی کارکنوں کو فارغ کیا گیا ہے۔ روزنامہ ''جناح'' سے نہ صرف بہت سے لوگوں کو نکالا گیا بلکہ انہیں کئی ماہ کی تنخواہ بھی ادا نہیں کی گئیں۔

اس وقت میڈیا کی صورت حال یہ ہے کہ مالکان نے صرف چند صحافیوں کو بھاری معاوضہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے جبکہ صحافیوں کی بھاری اکثریت معمولی روزانہ اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہے۔ ٹی وی چینلز میں ٹریڈ یونینوں کا کوئی وجود نہیں۔ اخباری اداروں میں کنٹریکٹ سسٹم پر ملازمت کی وجہ سے موثر ٹریڈ یونینوں کا وجود عملاً ختم ہو چکا ہے۔ صحافیوں اور دیگر کارکنوں کے ساتھ مالکان کی جانب سے روا رکھی جانے والی زیادتیوں کے خلاف کبھی کبھار یونین آف جرنلسٹ کی کمزور سی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ لیکن یہ آواز اس قدر کمزور ہے کہ آزاد عدلیہ بھی صحافیوں کے لئے وہ ایوارڈ پر عملدرآمد نہیں کرا سکی۔ آج صحافت کے گرتے ہوئے معیار کا رونا رویا جاتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، صحافی بحران کا شکار ہوگا تو صحافت کے ادارے بھی بحران کا شکار ہو جائیں گے۔

اخباری مالکان ''غریب'' ہو گئے

اخباری مالکان کی تنظیم آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (APNS) نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ 2009-10 کے بجٹ میں اخباری صنعت کے لئے ''بیل آوٹ پیکج'' کا اعلان کرے اور اسے وہولڈنگ ٹیکس، جنرل ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دے۔ اے پی این ایس نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ملکی اخباری صنعت عالمی مندے اور ملکی معیشت پر اس کے اثرات اور دو صوبوں میں سرکشی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہے۔ بیان میں حکومت پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اخباری صنعت کی بقا کے لئے فوری اقدامات کرے اور اے پی این ایس کی سفارشات کو آئندہ وفاقی بجٹ میں شامل کرے۔

(30 اپریل، روزنامہ ڈان، اسلام آباد)

برطانوی اخبارات پر عوامی بے اعتمادی

برطانیہ میں آجکل کی ماڈرن زندگی کا سب سے پریشان کن پہلو یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں میں میڈیا کے لئے عام طور پر اور اخبارات کے لئے خاص طور پر منفی رویے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ 'ایڈیلمین گلوبل ٹرسٹ بیرومیٹر' کے مطابق برطانیہ میں لوگوں کا اخبارات پر اعتبار 19 فیصد گر چکا ہے اور یہ پچھلے سال کی نسبت 10 فیصد زیادہ ہے۔

برطانیہ کے نشریاتی ادارے با اعتماد سمجھے جاتے تھے مگر ان پر بھی بھروسے میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ ریڈیو کی خبروں پر اعتماد میں کمی 20 فیصد اضافہ کے ساتھ 33 فیصد رہی اور ٹی وی کی خبروں پر بھی بھروسے میں کمی 33 فیصد واقع ہوئی ہے۔

برطانیہ سمیت دنیا کے 20 ملکوں میں گلوبل ٹرسٹ کا یہ سروے کیا گیا اور برطانوی میڈیا اعتبار کے حوالے سے سب سے نچلے درجہ پر آیا۔ میڈیا پر سب سے زیادہ بھروسہ انڈونیشیا میں 79 فیصد اور چین میں 73 فیصد رہا۔

سروے کے دوسرے حصے کے نتائج پر خاص طور پر چین کے حوالے سے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ مطلق العنان مرکزی ریاست جہاں پریس آزاد نہیں اور پریس فریڈم کی کوئی تاریخ بھی نہیں ملتی۔ ان حالات میں لوگوں سے کوئی معقول اور کارآمد تجزیے کی امید کرنا کافی مشکل ہوتا ہے (اس خوف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ لوگ اس قسم کے سروے میں ڈر کی وجہ سے غلط یا جھوٹے جوابات دے سکتے ہیں۔)

اگر ہم برطانوی نتائج کو انفرادی طور پر دیکھیں اور سروے کے ظاہری نتائج کو تسلیم کر لیں تو وہ باقی نتائج کی طرح ہیں جس کے مطابق روایتی میڈیا پر بے اعتمادی اور بھروسے کا فقدان نظر آتا ہے۔

عوام کو میڈیا پر اعتبار نہیں مگر اس کے برعکس میڈیا مسلسل یہ کہتا ہے کہ وہ عوام کے لئے ہی کام کرتا ہے تو میڈیا کو اپنی ہی بھلائی کے لئے ایسا سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا؟

کیا یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہمارے میڈیا کے تمام ادارے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بجائے ایک ہی جیسے بن گئے ہیں؟ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تمام میڈیا عوام کی بات کرنے کی بجائے ایک بزنس کی طرح صرف منافع کی ہی بات کرتا ہے یا پھر لوگوں کی میڈیا پر اس بے اعتمادی کی وجہ خود ساختہ اور جھوٹی سٹوریوں کی اشاعت ہے؟

اس سروے کی عجیب خصوصیت یہ تھی کہ نوجوان نسل (25 سے 34 سال) نے پرانی نسل (35 سے 64 سال) کی نسبت اس سماجی اور ڈیجیٹل میڈیا پر زیادہ اعتماد کا اظہار کیا۔

شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ، لوگ جیسے جیسے عمر رسیدہ ہوتے ہیں یا عام طور پر ذرائع ابلاغ کو سمجھتے ہیں ان کا میڈیا پر اعتبار کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔

برہان الدین حسن

اشتہار بازی کے معنی ہیں ''قیمتاً کسی غیر شخصی چیز، خیال یا خدمات کی تشہیر یا نمائش جو ایک جانے پہچانے ادارے یا کفیل کے ذریعے کی گئی ہو''۔ دوسرے لفظوں میں اشتہار بازی کے ذریعے ابلاغ عامہ کو معاوضہ ادا کر کے کسی چیز، خیال یا خدمات کو بیچا جاتا ہے۔

جیسے جیسے ایشیائی ممالک کی معیشت میں بہتری آرہی ہے اشیاء کے بارے میں آگاہی، ان کی قبولیت اور فروخت میں اضافہ کیلئے اشتہار بازی ایک ناگزیر عمل بنتا جارہا ہے۔ تمام اشتہارات کا بنیادی مقصد کسی پیغام کو ابلاغ کے وسیلہ سے ایک مخصوص طبقے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ مشتہرین کے پاس کمرشل ابلاغ میں اخبارات، میگزین، ریڈیو، ٹی وی، فلم اور بل بورڈ وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ مشتہرین نے اپنے طریقے بھی ایجاد کئے ہیں جن میں وہ بروشر، پمفلٹ یا تحریری مواد براہ راست صارف کو ڈاک کے ذریعے بھیج دیتے ہیں۔

ریڈیو میں اشتہارات کی آمد کے بعد اور پھر ٹی وی اور FM چینلز میں بھرمار سے پاکستان میں اشتہاری کمپنیوں کو بے پناہ ترقی ملی۔ اشتہارات کے ذریعے جو پیغام دیا جاتا ہے وہ مختصر، جاندار اور نہایت پرکشش ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اشتہارات ٹی وی کے بہت سے پروگراموں سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں اور زیادہ دیکھے جاتے ہیں۔

> **جب سے اشتہارات ٹی وی چینلز کی مالی معاونت کا بڑا ذریعہ بنے ہیں یہ ٹی وی چینلز اشتہارات کو اپنے پرائم ٹائم کا تیسرا حصہ دینے تک مائل ہو چکے ہیں بلکہ بعض مشہور پروگراموں، یہاں تک کہ خبروں کے دوران بھی اشتہارات کیلئے کوئی ٹائم مخصوص نہیں۔**

جب سے اشتہارات ٹی وی چینلز کی مالی معاونت کا بڑا ذریعہ بنے ہیں یہ ٹی وی چینلز اشتہارات کو اپنے پرائم ٹائم کا تیسرا حصہ دینے تک مائل ہو چکے ہیں بلکہ بعض مشہور پروگراموں، یہاں تک کہ خبروں کے دوران بھی اشتہارات کیلئے کوئی ٹائم مخصوص نہیں۔ اسطرح ناظرین بھی مسلسل کمرشل بریک سے تنگ آجاتے ہیں اور پروگرام کا تسلسل اور افادیت بھی قائم نہیں رہتی۔

اسی طرح زیادہ پڑھے جانے والے اخبارات بھی 50 فیصد جگہ، خاص طور پر پہلے اور آخری صفحہ پر اشتہارات کو دیتے ہیں۔ اشتہارات کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسہ اکٹھا کرنے کی جستجو میں یہ لوگ دل آزار، نازیبا، غیر شائستہ اور بعض اوقات غیر اخلاقی اشتہارات بھی چھاپنے اور نشر کرنے سے پرہیز نہیں کرتے جو کہ صحافیانہ اقدار کی صریحاً خلاف ورزی ہے جسے جان بوجھ کر پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ سامعین 24 گھنٹے ایک ہی طرح کے اشتہارات کے طوفان میں گھرے ہوئے ہیں جو ملک کی سماجی اور اخلاقی اقدار کو خراب کرنے میں گھناؤنا کردار ادا کر رہے ہیں اور عام اشیائے صرف کی قیمتوں میں ایک معقول تناسب کی بجائے بے انتہا اضافہ کا سبب بھی بن رہے ہیں۔

اشتہاری کمپنیوں کے ''خوابوں کے سوداگر'' دھوکے اور آرائش کا ایسا جال بن رہے ہیں اور پاکستان جیسے ملک میں جھوٹی خوشحالی اور بناوٹی معیشت کے سراب کو بڑھاوا دے رہے ہیں جہاں لاکھوں لوگ سخت غربت کے عالم میں رہتے ہیں جنہیں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ زیادہ تر ایسی اشیاء کے اشتہارات ہوتے ہیں جو صحت کیلئے نقصان دہ ہیں جیسے کہ جنک فوڈ اور اس کیلئے بچوں اور نوجوانوں کو خاص نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ایک اور غیر اخلاقی اور خطرناک اشتہاری شکل جسے "Puffery" یا ''تعریف اور مذمت کیلئے مبالغہ آرائی کرنا'' کہا جاتا ہے، امریکہ کی عام زبان میں 'بے انتہا بڑھا چڑھا کر یا جابرانہ مسخ شدہ دعوے' کرنا کہتے ہیں، اشتہارات میں دکھائے جاتے ہیں۔ امریکہ کی سپریم کورٹ نے فیڈرل ٹریڈ کمیشن (FTC) کو اختیار دیا ہے کہ اس قسم کے جھوٹے اور گمراہ کن اشتہارات کو بند کریں جو صارف کو ورغلا کر اپنی مضر صحت اشیاء بیچتے ہیں۔ FTC نے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اس قسم کے اشتہاروں پر پابندی عائد کی اور ان پر جرمانے بھی لگائے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے قواعد وضوابط بھی بنائے جو خاص طور پر بچوں کی اشیاء کے اشتہارات کی روک تھام کیلئے ہیں۔

امریکہ میں ان عوامل کے نتیجہ میں اس بے انتہا بگاڑ اور غلط نمائندگی میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ اسی طرح ایسے اشتہارات جیسے سگریٹ نوشی، کچھ خاص ادویات اور سخت قسم کی شراب جو مضر صحت ہے، کے اشتہاروں پر بھی پابندی لگائی گئی ہے۔ یہ پابندی امریکہ کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بھی لگائی گئی ہے۔

پاکستان جنوبی ایشیاء کا شاید واحد ملک ہے جہاں وہ اشیاء جو صحت کیلئے نقصان دہ ہیں ان کی تشہیر Puffery اصول کے تحت کھلے عام کی جاتی ہے۔ جو جھوٹ اور مسخ شدہ دعووں پر منحصر ہے۔ یہاں کوئی ایسا ادارہ، سرکاری یا غیر سرکاری موجود نہیں جو ان تکلیف دہ اور مضر صحت اشتہاروں کو روک سکے ورنہ ہی سوسائٹی کا کوئی ایسا پریشر گروپ ہے جو انجان صارف کو تحفظ دے سکے۔

پاکستان ایڈورٹائزنگ ایسوسی ایشن جو کمپنیز آرڈیننس کے تحت رجسٹر ہے اس کی تحریری دستاویز کی ایک شق کے مطابق اشتہارات کے آرٹ اور کاروبار کو غیر اخلاقی طریقوں، قومی اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی اجارہ داری سے تحفظ دیا جائے گا۔ مگر آجکل کے حالات سے ایسا لگتا ہے کہ اس شق پر جان بوجھ کر عملدرآمد نہیں کیا جارہا۔

اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ پاکستان کی اخباری صنعت اور الیکٹرانک میڈیا مل کر صارفین کے تحفظ کیلئے ایک طاقتور تعلیمی پروگرام ترتیب دیں جس سے،

الف) صنعت کاروں کے اشیاء اور خدمات سے متعلق گمراہ کن دعوے اور ان کی فروخت کیلئے مشتہرین کے غلط طریقوں سے صارفین کو محفوظ کیا جائے۔

ب) اشتہارات سے متاثر ہو کر حد سے زیادہ خرچ کو روکا جائے۔

ج) بچوں پر اشتہارات کے برے اثرات سے بچا جاسکے

حکومت کو بھی اس معاملے میں غور کرنا چاہیے کہ FTC جیسا ادارہ پاکستان میں بھی ہو جو یہاں کے صارفین کا غلط اور نقصان دہ اشتہار بازی سے تحفظ کر سکے۔

وکلاء تحریک میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار

سلمان عابد

پاکستان میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت و افادیت سے کسی کو بھی انکار نہیں یہ ہی وجہ ہے کہ میڈیا سے وابستہ افراد، ان کی ایسوسی ایشنز و دیگر اداروں نے ریاستی میڈیا کے اداروں کے مقابلے میں نہ صرف آزاد میڈیا کی بات کی ہے بلکہ اس کیلئے ان کی جدوجہد کی داستان بھی طویل ہے۔ بالخصوص پرنٹ میڈیا سے وابستہ افراد اور اداروں کی جدوجہد کی ایک طویل کہانی ہے جس پر کئی ابواب لکھے جاسکتے ہیں۔ پاکستان میں جب پرائیویٹ میڈیا کو کام کرنے کی آزادی ملی تو ملک میں کئی نئے چینلز معرض وجود میں آئے۔ ان میں علاقائی اور قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی زبان انگریزی میں بھی ٹی وی چینلز شامل ہیں۔ آزاد میڈیا کا یہ وجود میڈیا کی ملکی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل ہمارے لئے سچ جاننے اور معلومات کے حصول کا واحد ذریعہ ریاستی میڈیا ہی ہوتا تھا۔ ریاستی میڈیا اور اس کے کردار سے لوگ کس حد تک مطمئن تھے، یہ ہم سب جانتے ہیں۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ صرف حالات کی ایک رخی تصویر پیش کرتا ہے جو ریاست اور حکومتی موقف کے قریب ترین ہوتا ہے، جس میں سچ کے پہلو کو دانستہ طور پر نظرانداز کیا جاتا ہے۔

میڈیا میں دکھایا جانے والا نصف سچ لوگوں کیلئے ایک خطرناک بم کی حیثیت رکھتا ہے جو لوگوں کو حقائق کے قریب لانے کی بجائے انہیں گمراہ کرنے کا موجب بنتا ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب الیکٹرانک میڈیا نجی سطح پر سامنے آیا تو لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ حتی کہ اس وقت کی حکومت نے میڈیا کی اس آزادی کا تمام تر کریڈٹ لینے کی کھلم کھلا کوشش کی کہ میڈیا کی اس آزادی کے پیچھے اس کی اپنی سوچ کارفرما ہے۔ مگر جب ان چینلز کا آغاز ہوا تو ہماری سیاسی اشرافیہ اور طاقت کے مراکز میں موجود مختلف فریقین شاید اس کی اہمیت کا وہ اندازہ نہیں کر پائے تھے جو آج ہمارے سامنے ہے اور اب وہ اسے ایک بڑی سیاسی طاقت کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ اب تو میڈیا اور اس سے وابستہ افراد کی جانب سے یہ تاثر بھی سامنے آرہا ہے کہ وہ ہی اس ملک میں اصل طاقت ہیں جو سب کچھ بدل سکتے ہیں۔ گو کہ تبدیلی کا عمل مختلف اداروں کے عملی اقدامات کے طریقہ کار سے جڑا ہوتا ہے اور تبدیلی کبھی بھی سیاسی تنہائی میں نہیں آتی۔ میڈیا کا کام اس آنے والی تبدیلی کے مثبت رُخ اور لوگوں کو اس تبدیلی سے متعلقہ معلومات، نتائج، اس کے اچھے پہلوؤں اور بُرے مضمرات سے آگاہ رکھنا ہوتا ہے کہ جو تبدیلی آ رہی ہے اسے مثبت رُخ میں تبدیل کیا جاسکے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عوام اور اشرافیہ دو طرز کے خیالات میں تقسیم ہیں جن میں اول وہ عناصر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اس وقت میڈیا ایک کلیدی کردار ادا کر رہا ہے اور اس کے اب تک کے تمام اقدامات حق پر ہیں لہذا اس پر تنقید نہیں کی جانی چاہیے۔ جبکہ اس کے برعکس ایک گروہ وہ بھی ہے جن کے خیال میں میڈیا اپنے بعض اچھے اقدامات کے ساتھ ساتھ کچھ معاملات میں فریق بھی بن گیا ہے اور اپنے دائرہ کار سے آگے نکل گیا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی آزادی ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں موجود غلطیاں ختم ہو جائیں گی اور میڈیا میں ایک سیاسی پختگی آجائے گی۔ میڈیا مستقبل میں کیا شکل اختیار کرے گا' یہ تو وقت ہی بتائے گا تاہم فی الوقت میڈیا کے موجودہ رویے میڈیا اور حکومت کے درمیان ایک ٹکراؤ کا واضح منظر پیش کرتے نظر آتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومت میڈیا سے بعض معاملات میں خاصی نالاں ہے۔ اس کا اظہار حالیہ وکلاء تحریک میں حکومت اور پیمرا (PEMRA) کی جانب سے بعض میڈیا چینلز پر پابندی یا مختلف رکاوٹوں کی صورت میں ہوا۔ حکومت سے وابستہ افراد نے صاف لفظوں میں کہا کہ وکلاء کی تحریک کوئی عوامی اور موثر تحریک نہیں ہے اسے صرف میڈیا اور اس سے وابستہ افراد چلا رہے ہیں جس کا مقصد جسٹس کی بحالی سے زیادہ حکومت کو غیر مستحکم کرنا ہے۔ صدر آصف علی زرداری سمیت حکومت کے بیشتر ارکان نے یہ بھی کہا کہ میڈیا اپنی حدود سے تجاوز کر رہا ہے۔

آیئے اس صورت حال میں ایک غیر جانبدارانہ نگاہ الیکٹرانک میڈیا پر بھی ڈالتے ہیں کہ وہ اس سارے عمل میں کیا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وکلاء تحریک اس ملک کی ایک اہم تحریک تھی جس نے معاشرے میں بہت کچھ بدلا ہے۔ اگر میڈیا سے وابستہ افراد بھی اس تحریک کا حصہ بنے ہیں تو یہ بہت انہونی بات نہیں تھی۔ میڈیا اور میڈیا سے وابستہ لوگوں کی وکلاء تحریک کے بنیادی مقصد (عدلیہ کی بحالی) سے وابستگی بھی کوئی غیر جمہوری عمل نہیں تھا۔ یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ ججوں کی بحالی میں جہاں مختلف فریقین کا اہم کردار تھا وہاں میڈیا کا اپنا کردار بھی کافی اہم تھا اور اس کے دباؤ نے بھی ججوں کی بحالی میں اپنا رول ادا کیا۔ مگر اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ میڈیا سے وابستہ کچھ افراد عملاً ایک فریق کے طور پر سامنے آئے۔ میرے نزدیک فریق بننا بھی کوئی بُرا فعل نہیں مگر جب ہم کسی ایک نقطہ نظر پر فریق بن جاتے ہیں تو اس میں بعض اوقات بطور فریق تعصب کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں جس سے دوسرے نقطہ نظر کے حامی افراد کو یہ جواز ملتا ہے کہ وہ میڈیا کی آزادی کو نہ صرف چیلنج کرتے ہیں بلکہ میڈیا پر الزامات عائد کرنے کی وجہ پیدا ہو جاتی ہے کہ میڈیا کسی تحریک یا گروہ کیلئے بطور فریق کام کر رہا ہے اور ایسا ہونا میڈیا کی غیر جانبداری کو مشکوک کر دیتا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ میڈیا کی اپنی حدود و قیود ہوتی ہیں جس کے اندر رہتے ہوئے اسے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا ہوتی ہیں۔

دوسری طرف حکومت یا ریاست اپنے طور پر پیمرا (PEMRA) کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کے مطابق حالات کو بہتر کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں میڈیا سے متعلق شکایات بھی شامل ہیں۔ اس کے برعکس اگر پیمرا' میڈیا ایسوسی ایشنز اور ایڈیٹرز مالکان کے نمائندے مل کر ایک دوسرے کی جانب سے پیش آنے والی شکایات پر مشترکہ حکمت عملی اپنا سکیں تو اس کے نتائج یقیناً بہتر ہونگے اور یہ ہی ایک مناسب اور جمہوری طرز عمل ہوگا جس سے میڈیا اور حکومت کے درمیان بہتر تعلقات استوار ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر حکومت میڈیا سے طاقت کے انداز میں بات کرتی ہے یا ان پر پابندیاں عائد کرتی ہے تو یہ مسئلے کا حل نہیں ہے' مزید یہ کہ اس طرح کے اقدامات سے فریقین کے درمیان اعتماد سازی بھی متاثر ہوگی اور اسے حکومت کی جانب سے سیاسی ستم گری سمجھا جائے گا جو مناسب نہیں ہوگا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ وکلاء تحریک کے دوران میڈیا میں بعض ایسے امور بھی دیکھنے کو ملے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے قبل لال مسجد کے

ایک معروف اینکر پرسن ججوں کی بحالی سے کچھ وقت پہلے اس حد تک جذباتی ہو گئے کہ انہوں نے پاک فوج اور جنرل اشفاق پرویز کیانی کے کردار کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ فوج نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی سابقہ روایات چھوڑ کر ملک میں جمہوریت کو مضبوط کیا ہے۔ جبکہ اس پہلو پر بات کرنے کیلئے کوئی تیار نہیں تھا کہ اس سیاسی جنگ میں جو عدالتی تناظر میں لڑی گئی اس میں پاک فوج کے سربراہ کن شرائط پر معاملہ کروانے کی کوشش کر رہے تھے اور کیوں انکی ضرورت پیش آئی کہ سیاسی قوتوں کی بجائے فوج کو قومی مفاہمت کے نام پر اپنا کردار ادا کرنا پڑا

سانحہ پر بھی میڈیا میں کئی طرح کے جذباتی مناظر لوگوں نے دیکھے ہیں جہاں ابھی خاصی سنسنی پھیلائی گئی تھی۔ ججوں کی بحالی کے آخری حصے میں لوگوں نے ایک بار پھر اسی طرح کے مناظر دیکھے۔ مثلاً ایک معروف اینکر پرسن ججوں کی بحالی سے کچھ وقت پہلے اس حد تک جذباتی ہو گئے کہ انہوں نے پاک فوج اور جنرل اشفاق پرویز کیانی کے کردار کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ فوج نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی سابقہ روایات چھوڑ کر ملک میں جمہوریت کو مضبوط کیا ہے۔ جبکہ اس پہلو پر بات کرنے کیلئے کوئی تیار نہیں تھا کہ اس سیاسی جنگ میں جو عدالتی تناظر میں لڑی گئی اس میں پاک فوج کے سربراہ کن شرائط پر معاہدہ کروانے کی کوشش کر رہے تھے اور کیوں انکی ضرورت پیش آئی کہ سیاسی قوتوں کی بجائے فوج کو قومی مفاہمت کے نام پر اپنا کردار ادا کرنا پڑا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ ججوں کی بحالی کے مسئلے میں امریکہ، برطانیہ اور متحدہ عرب امارات نے پس پردہ اور کسی حد تک بڑا واضح کردار ادا کیا اس کے اصل محرکات کیا تھے۔ ججوں کی بحالی کے بعد یہ بھی ہوا کہ ایک اخبار اور ٹی وی چینل نے ججوں کی بحالی کے تناظر میں فوج کی جمہوریت سے کمٹمنٹ اور امریکہ کے انصاف پر مبنی اصولوں کے کردار کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔

یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض اینکر پرسن حکومتی ارکان سے ججوں کی بحالی کے معاملے میں اس قدر اُلجھے ہوئے نظر آئے کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لوگ (میڈیا) بھی حکومت کے مقابلے میں حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہے ہیں حالانکہ ان کا کام مختلف سوالات کے ذریعے درپیش مسئلے پر مختلف آراء کو زیر بحث لانا اور اس پر فریقین کے موقف کو احسن انداز میں پیش کرنا مقصود تھا۔

میڈیا ایکٹوازم بُری بات نہیں مگر یہ معاملہ اگر اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو بعض اوقات میڈیا کی سطح پر کچھ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ میڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق 12-11-10 مارچ کو تین بڑے ٹی وی چینلز میں 72 گھنٹوں کی نشریات میں میڈیا سے وابستہ افراد کو حکومت کی مخالفت میں 17 سے 19 گھنٹے جبکہ حکمران اتحاد کو 72 گھنٹوں میں سے صرف 67 منٹ دیئے گئے۔ یہ تصویر ظاہر کرتی ہے کہ معاملات کو حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان برابری کی بنیاد پر نہیں چلایا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ جسے "ہم" بہتر سمجھتے ہیں اسی نقطہ نظر کو زیادہ فوقیت دی جائے گی جو یقیناً صحافتی اصولوں کے سراسر منافی ہے۔ اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بعض اینکر پرسن اپنی گفتگو میں خود ہی فیصلہ بھی دے رہے ہوتے ہیں۔ زیر بحث مسئلے پر یہ اینکر پرسن خود زیادہ وقت لیتے ہیں اور مہمانوں کو بولنے کا کم موقع دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی یہ کوشش بھی صاف نظر آتی رہی کہ مہمان اگر ان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر بات کرنا چاہتے تو یہ اینکر پرسن بات کو ادھورا چھوڑ کر بات کا رُخ بدل دیتے۔ وکلا تحریک سے وابستہ افراد ججوں کی بحالی کو اس انداز میں پیش کرتے رہے جس سے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ توقعات بنیں اور عام آدمی یہ سمجھنے لگا کہ ججوں کی بحالی سے اس ملک کے تمام تر مسائل پلک جھپکتے میں حل ہو جائیں گے، ظاہر ہے یہ انتہائی غیر مناسب رویہ تھا۔ ججوں کی بحالی جس انداز میں اور جن شرائط پر ہوئی، اس میں جو بیرونی طاقتیں کارفرما رہیں اس پہلو پر میڈیا کی خاموشی بجائے خود اس کے "آزادانہ" کردار کو مشکوک بنانے کیلئے کافی ہے۔ بیرونی مداخلت سے قطع نظر 15 مارچ کو اسلام آباد میں جی ایچ کیو اور ایوان صدر میں کیا معاملات طے پائے اور شہباز شریف و اسحاق ڈار کی پس پردہ مفاہمت کے پہلو کو بھی میڈیا لوگوں کے سامنے نہیں لایا۔

ججوں کی بحالی سے چند روز پہلے سے لے کر آخری دن تک ہر طرح کی افواہ اور (خودساختہ) مفروضوں پر مبنی چٹ پٹی خبریں میڈیا کی زینت بنتی رہیں جس میں مائینس ون، ٹو اور تھری فارمولا، سیاسی نظام کی بساط کو لپیٹنے، گورنر پنجاب کی تبدیلی سمیت بہت سے سنجیدہ امور شامل رہے۔ جبکہ میڈیا کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خبر جاری/نشر کرنے سے قبل اس کی صداقت کو یقینی بنانے کے عمل کے کیلئے درکار تحقیق کو مضبوط بنائے اور پھر خبر شائع/نشر کی جائے۔ یہ میڈیا کے مسلمہ اصولوں میں سے ایک ہے جسے نظر انداز کرنے کا مطلب اپنے ہی اصول و ضوابط کو نظر انداز کرنا ہے۔ اس تحریک کے آخری حصے میں یہ بھی ہوا کہ وکلا قیادت کے مقابلے میں سیاسی قیادت اور وہ بھی مسلم لیگ (ن) کی بہت زیادہ پروجیکشن کی گئی۔ اس تحریک میں جماعت اسلامی اور تحریک انصاف کو وہ پزیرائی نہیں دی گئی جو ان کا حق بنتا تھا۔ گویا میڈیا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ تحریک مسلم لیگ (ن) ہی کی ہے۔ میڈیا کا یہ رویہ لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال چھوڑ گیا ہے۔

بعض میڈیا پرسن نے اپنے تئیں یہ کام بھی کر دکھایا کہ وہ زیر اعظم کو اپنے حق کیلئے ایوان صدر پر چڑھ دوڑنے کا مشورہ دیتے رہے، گویا میڈیا کو یہ بھی کرنا چاہیے! الیکٹرانک میڈیا میں یہ تاثر بٹایا جا رہا ہے کہ "کامیاب" اینکر پرسن یا پروگرام وہ ہوتا ہے جس میں شریک گفتگو مختلف فریق ایک دوسرے سے اُلجھتے رہیں یا اینکر پرسن اپنی گفتگو سے ایسی جذباتی فضا بنا دے کہ پروگرام میں سنجیدگی کم اور محاذ آرائی کا عنصر غالب نظر آئے۔ یقیناً یہ انداز فکر و عمل از خود غیر سنجیدہ ہے جسکی حوصلہ شکنی میڈیا کے اپنے اندر سے بھی ہونی چاہیے اور معاشرے کے مختلف گروہوں کو بھی صحت مند میڈیا کی تخلیق کی خاطر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

ہمارا مقصد وکلا تحریک کے حوالے سے حکومت کے موقف کی تائید کرنا نہیں ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ حکومتی محاذ پر بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جو خود حکومت کیلئے سبکی کا باعث بنی ہیں۔ ان کے موقف میں موجود تضادات نے ان کی اپنی جماعت میں انتشار پیدا کیا جس کا انہیں فوری طور پر خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہاں یہ کہنا بھی چاہیں گے کہ ہمیں ایک ذمہ دار میڈیا کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے کیونکہ اب تک جس انداز میں میڈیا چل رہا ہے اس کو اسی انداز میں آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اگر میڈیا نے غیر ذمہ دارانہ کردار سے غفلت برتی (جیسا کہ اب تک دیکھنے میں آیا ہے) تو میڈیا کی اپنی ساکھ پر کئی طرح کے سوالات اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف حقائق کو غیر ذمہ دارانہ انداز میں پیش کریں بلکہ دلیل میں جذباتیت کی بجائے تحقیق، متانت اور سنجیدگی کو برقرار رکھا جائے تاکہ لوگ ہماری بات پر اعتماد کر سکیں۔ لوگوں کا میڈیا پر اعتماد کرنا میڈیا کو "تسلیم" کرنے کے مترادف ہے جو خود میڈیا کی بقاء اور وقار کیلئے انتہائی ضروری ہے۔

آج کے میڈیا کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ صحافیوں اور ایڈیٹرز کا جو رول ہوتا تھا اب وہ ان کے پاس نہیں رہا، یہ رول خود مالکان کے پاس چلا گیا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ مالکان نے پالیسی اور فیصلہ کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے اور کام کرنے والے صحافی اب صرف 'ملازم' ہیں۔ مالکان میڈیا کو ایک انڈسٹری کے طور پر دیکھتے ہیں اور اپنی سرمایہ کاری سے منافع اور زیادہ سے زیادہ منافع کا حصول ان کا مطمع نظر ہے۔ میڈیا کے امور کا تجربہ بہت سے میڈیا ہاؤسز کے مالکان کے پاس نہیں ہے۔ اس تمام تر صورت حال کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اگر میڈیا میں کام کرنے والے صحافیوں میں صورتحال کی بہتری کے حوالے سے ایک واضح سمت ہو تو تمام تر نامساعد حالات کے باوجود بہت کچھ کرنے کی صلاحیت ہمارے پاس ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ تسلیم کریں کہ میڈیا کی موجودہ صورت حال کو 'سب اچھا ہے' نہیں کہنا چاہیے۔ اس میں بہت حد تک بہتری لانے کی اشد ضرورت ہے۔ جذباتیت کے سہارے چلنے والے میڈیا کی عمر زیادہ لمبی ہو نہیں سکتی اس لئے ضروری ہے کہ میڈیا مالکان اور صحافی مل بیٹھ کر اس صورت حال کا سنجیدگی سے جائزہ لیں۔ اس حوالے سے میرے خیال میں میڈیا ایسوسی ایشنز بہت بہتر اور موثر کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ صحافیوں کے حوالے سے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ بین الاقوامی میڈیا کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے صحافیوں کی صلاحیتوں کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت بھی ہے۔ حساس معاملات کی رپورٹنگ کے تقاضے کیا ہیں، وار زون کی رپورٹنگ کرتے ہوئے ایک صحافی کو کن چیزوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے، یہ اور بہت سے دیگر امور پر کام کرتے ہوئے صحافی کی ذمہ داریاں کیا ہیں، ان پر بات کرنے اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔

حال ہی میں لاہور پولیس ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں ہونے والی دہشت گردی میں میڈیا نے لائیو کوریج کے ساتھ اور بہت کچھ دکھانے کی کوشش کے باعث آپریشن میں موجود لوگوں کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، میڈیا کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دوران آپریشن ہم "سب سے پہلے ہماری خبر" کیلئے کوشاں تھے۔ یہ خیال بھی درست ہے کہ میڈیا میں آنے والے نئے دوستوں کی تربیت پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال غلط نہیں لیکن جن لوگوں سے غلطیاں ہو رہی ہیں ان میں بھی صحافت کا وسیع تجربہ رکھنے والے شامل ہیں۔ صلاحیتیں اپنی جگہ بہت اہم ہوتی ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ کیا ہم سنسنی خیزی کے خاتمے کیلئے سیاسی کمٹمنٹ رکھتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بہت سی صلاحیتوں کے باوجود ہم وہ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے جس کی خواہش ہم رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں سول سوسائٹی کا کردار بہت اہم ہے۔ اسے ریاست اور میڈیا کے درمیان ایک پُل کا کردار ادا کرنا ہوگا اور ایک آئینے کا بھی، تاکہ دونوں اطراف میں توازن قائم ہو سکے۔ لیکن اس سچائی سے بھی صرف نظر نہیں کیا جانا چاہیے کہ ہماری سول سوسائٹی بھی سیاسی جماعتوں کی طرح میڈیا میں ہونے والی غلطیوں پر خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ اس صورت حال پر بھی سنجیدگی سے غور و فکر ہونا چاہیے۔

میڈیا اور سیاست

جعفر مہدی

پاکستان میں میڈیا چینلز کی افزائش کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستانی ٹی وی چینلز ایک سیاسی پارٹی کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اب ایک سیاستدان کو اپنی سیاست چمکانے یا ووٹ مانگنے گلی گلی لوگوں کے پاس نہیں جانا پڑتا بلکہ وہ کسی بھی ٹی وی سٹوڈیو میں بیٹھ کر اپنے سیاسی منشور کی تفصیل بتا سکتا ہے یا دوسروں کی سیاست پر کیچڑ اچھال سکتا ہے۔ ان چینلز پر کرنٹ افیئرز کے نام پر جو پروگرام بنائے جاتے ہیں ان میں سیاست ہی سب سے بڑا موضوع ہوتا ہے، زمینی حقائق سے بہت دور یہ چینلز عام لوگوں کو سیاسی طور پر صرف الجھا کر رکھتے ہیں اور اس سارے کھیل کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ اس طرح لوگوں میں سیاسی شعور اجاگر ہوتا ہے مگر شاید اس طرح لوگ سیاست اور سیاستدانوں سے بدل ہو رہے ہیں۔

رچرڈ آنگرنے، جو امریکہ کے صدر ریگن اور بش کے میڈیا ایڈوائزر رہے ہیں ایک مرتبہ ایک صحافی سے کہا کہ جب ہر صبح آپ اٹھتے ہیں تو صرف یہ سوچتے ہیں کہ اپنے صدر کی تذلیل کس طرح کی جائے جبکہ میں یہ سوچتا ہوں کہ کیسے ان کو میڈیا میں بہتر پیش کر سکوں اور میں آپ کی نسبت سکون کی نیند سوتا ہوں۔

صحافی، تقابلی طور پر کامیابی کے لفظ سے پوری طرح آشنا نہیں۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں کا مخالف سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ حکومت کے ہر کام پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، حکومتی اہلکاروں سے مشکل سوال کرتے ہیں اور اپنے حریف کو پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں جو خبر کو خبری رکھنا چاہتا ہے، تہلکہ نہیں۔ یہ رویہ کارآمد ضرور ہو سکتا ہے مگر اس کے منفی اثرات بھی ہوتے ہیں۔ اس مخالفانہ انداز سے پریس کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ وہ مسلسل اور تحقیق کے ساتھ صرف شک پر مبنی سوالات کو اچھالتے رہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر پریس کی جیت ہوتی ہے تو یہ کامیابی اس منفی صحافیانہ سطحے کی ہے جو صرف منفی تنقید پر مبنی ہے۔ اس سے عام لوگوں کی زندگی پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑتا۔

یہ حقیقت بھی ہے اور آجکل لوگ اس کی شکایت بھی کر رہے ہیں کہ میڈیا کی خبریں زیادہ تر منفی ہوتی ہیں جبکہ خبر کا موضوع اتنا منفی نہیں ہوتا۔ کچھ تنقید نگار اس طرح کہتے ہیں کہ یہ صحافی کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ بعض اوقات صحافی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ دوسرا زیر ہو جائے۔

> سیاست ایک شعوری عمل ہے جو انسان اپنے دماغ سے ایک معاہدے کے طور پر کرتا ہے اور ہر معاہدے کی طرح اس کے نتیجے بھی ہوتے ہیں جو کہ بعض دفعہ بھگتنا بھی پڑتے ہیں

ہمارا میڈیا متنازعہ عوامی مسائل کو نظر انداز کر کے یا تو کسی سیاست دان کی سیاست چمکاتا ہے یا پھر کسی خاص گروپ کے خاص مقاصد کے حصول کے لئے کام کرتا ہے۔ بڑے پیمانے پر تو دور کی بات کسی بھی پیمانے پر عام آدمی کی بات میڈیا پر نہیں کی جاتی اور اگر کہیں کی بھی جاتی ہے تو اس بھونڈے انداز میں کہ اس میں تذلیل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اگر میڈیا خود سیاسی امیدوار نہیں یا کسی خاص گروہ کے کسی خاص مقصد کے لئے کام نہیں کرتا تو پھر میڈیا "کس" کی مدد کر رہا ہے؟ اگر صرف مخالف ہونا ہی کافی نہیں تو صحافی سیاست اور عام آدمی کی زندگی پر کیا رپورٹ کرے گا؟ ان سوالوں کے جوابات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ سیاست کے اصل معنی کیا ہیں؟ اور یہ فہم و دانش کی سوچ صحافی حضرات کم کم ہی استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر کسی سیاسی لیڈر سے بات کرتے وقت وہ خود کو اس طرف مائل نہیں کرتے کہ سیاست کا مطلب کیا ہے۔ عام طور پر صحافی کے ذہن میں صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ تو "سیاسی گفتگو" ہے جس میں ووٹ کیسے لئے جائیں، کس کام کا ٹھیکہ کس طرح لیا جائے یا پھر اپنے حریف کو کیسے زیر کیا جائے اور کس طرح تذلیل کی جائے۔ جبکہ سیاست ایک تقابلی جدوجہد کا نام ہے جس میں ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر انسانیت کے لئے بڑے پیمانے پر جنگ لڑی جاتی ہے اور جس میں قابل اور حوصلہ مند افراد آگے سے آگے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ہم دفتری سیاست کی بات کرتے ہیں تو یہ چار دیواری میں لڑی جانے والی ایک انفرادی جنگ یا جدوجہد ہوتی ہے جس میں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر لمبی لمبی بحثیں ہوتی ہیں، شاید اسی لئے کسی بڑے کامیاب ادارے کا سربراہ یا مالک دفتری سیاست میں حصہ نہیں لیتا کیونکہ اس نے بڑے پیمانے پر سوچنا ہوتا ہے۔ مگر اکثر صحافی سیاست کے اصل معنی بھول کر اسی قسم کی سیاست کو ملکی سیاست کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

سیاست کی اصطلاح کو سمجھنا اتنا آسان بھی نہیں کیونکہ الفاظ اور معنی میں فرق ہوتا ہے۔ سیاست ایک شعوری عمل ہے جو انسان اپنے دماغ سے ایک معاہدے کے طور پر کرتا ہے اور ہر معاہدے کی طرح اس کے نتیجے بھی ہوتے ہیں جو کہ بعض دفعہ بھگتنا بھی پڑتے ہیں۔ کرسٹوفر لیش جو تاریخ اور عمرانیات کے نقاد ہیں ان

کی تنقیدی نگاہ میں آجکل سیاست جنگ کا دوسرا نام بن چکا ہے اور اس عمل کے نتیجے میں یہ تصور غالب آتا جارہا ہے کہ سیاست کا سچ کی تلاش اور انسانی اقدار کو زندہ رکھنے سے تعلق ختم ہوتا جارہا ہے۔ سیاست اب طاقت کی حکمرانی بنتی جارہی ہے یا جس کی آواز زیادہ اونچی ہوگی وہ بڑا سیاست دان ہوگا۔

اس خیال کے مطابق لوگ سیاست سے ناخوش ہوتے جارہے ہیں اور ہمارا میڈیا بھی مسلسل اسی کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ اگر کسی ٹی وی چینل پر صحت سے متعلق کوئی پروگرام پیش کیا جاتا ہے تو اس میں مختلف انڈسٹریز کا بہت ہی متوازی انداز میں خیال رکھا جاتا ہے مگر سیاست کے پروگرام میں صرف ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے، سیاست اور سیاست دانوں کی تذلیل کی جاتی ہے تاکہ لوگ سیاست اور سیاستدانوں سے پیچھے ہٹنا شروع ہوجائیں اور یہاں تک بیزار ہوجائیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ اس سیاست سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا یا پھر یہ کہ یہ سب جھوٹے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے رویے سیاست اور سیاست دانوں کیلئے نفرت میں بدلتے جارہے ہیں، میڈیا کے اس کھیل میں صحافیوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میڈیا یہ دکھاتا ہے کہ سیاست جنگ کا دوسرا نام ہے اور اس روایتی جنگ میں میڈیا کی ذمہ داری یہ ہے کہ لڑائی کے طریقوں کا جائزہ لے اور مختلف حریفوں کے ذاتی مفادکی نمائش کرے۔ اس سارے سلسلے میں میڈیا کا کردار ایک نکمی مسہر کی طرح بن جاتا ہے جس کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ دونوں فریقین میں سے کون جیتا اور کون ہارا۔

اگر میڈیا خود سیاسی امیدوار نہیں یا کسی خاص گروہ کے کسی خاص مقصد کے لئے کام نہیں کرتا تو پھر میڈیا ''کس'' کی مدد کر رہا ہے!

سیاست کی صحیح تعریف کیا ہے؟ سیاست محض الیکشن جیتنے، طاقت کی جدوجہد یا حکمرانی نہیں بلکہ یہ لوگوں کو جاننے کا ایک علم ہے۔ سیاست میں ہر علاقے کی روایات اور تہذیب وثقافت کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ روایات اور تہذیب وتمدن علاقے کے لوگوں کی غمازی کرتے ہیں، سیاست میں جمہوریت اپنے مسائل کو سمجھتی ہے، اپنے مقاصد کی طرف مائل ہوتی ہے یا پھر وقت کے حساب سے اپنے اندر ایک تبدیلی کی کوشش کرتی ہے۔ جمہوریت کے بنیادی عقیدہ کا دوسرا نام سیاست ہے۔

اگر ''ہم لوگ'' اپنے آپ کو لیڈر مان لیں تو ہم پر مسلسل یہ باتیں عیاں ہوگی کہ ''ہم'' کیا بن گئے ہیں، ''ہم'' کیا چاہتے ہیں اور ایک معاشرے کے طور پر ''ہم'' کدھر جارہے ہیں۔ سیاست کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہم حالات وواقعات کو اس طرح سمجھیں جس طرح الیکشن میں ایک سیاست دان کو سمجھنا چاہیے۔ معشل سینڈل کے مطابق جو ایک سکالر ہیں ''جب سیاست صحیح طرز پر چل رہی ہوتی ہے، تو ایک اچھی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ صرف ہم اکیلے سب کچھ نہیں جان سکتے''۔

اگر جمہوری سیاست کے اس مقصد کو صحیح مان لیا جائے تو اپنی مخلصانہ کوشش سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ اکیلے ہم کیا نہیں جان سکتے اور پھر صحافی کا منفی یا غیر جانبدارانہ کردار کی بجائے مثبت کردار سامنے آجائے گا۔ اس طرح صحافی کا کام صرف حکومت پر نگاہ رکھنا، الیکشن کی گنتی گنانا یا ایک کلرک کا نہیں رہ جاتا اور نہ ہی باہر بیٹھ کر ہر ایک کے خلاف ہونا، بلکہ ان کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ سیاست کو بہتر طور پر چلنے میں مدد کریں۔ صحافیوں کو اپنے تمام اثر ورسوخ اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے حالات پیدا کرنے چاہیں جن سے لوگوں کو عام باتیں سمجھنے میں مدد مل سکے جن کی ان کو ضرورت ہے۔

ان سب حالات کے پیش نظر میڈیا کے پروگراموں میں سیاست پر گفتگو غالب آنی چاہیے نہ کہ سیاست دانوں پر اور اس گفتگو میں جمہوریت کو اس کے مخصوص انداز میں پیش کیا جانا چاہیے۔ اول یہ اتنی عام فہم اور آسان ہونی چاہیے کہ سب کی سمجھ میں آسکے اور ان تمام مسائل کو اجاگر کرنا چاہیے جو ہمارے معاشرے میں مثبت تبدیلی اور عام آدمی کی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں۔ اس گفتگو کو ایک مہذب انداز میں پیش کیا جانا چاہیے یعنی گفتگو کے دوران اختلافات اور تنازعات بھی پیدا ہوں مگر گفتگو اپنے موضوع کے لحاظ سے آگے بڑھتی رہے۔ دوسرے الفاظ میں گفتگو میں عوامی امنگوں کا دھیان رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس قسم کی گفتگو میں عوام کی چھوٹی چھوٹی مشکلات کو اس خوبصورتی سے ابھارنا چاہیے اور ان کو بڑے مسائل کے ساتھ اس انداز میں جوڑنا چاہیے کہ بڑے پیمانے پر عوام کی بھلائی ہو نہ کہ کسی سیاست دان کی سیاسی دوکان کو فائدہ حاصل ہو۔ اس قسم کی گفتگو کو ہم ''عوامی بحث مباحثے'' کا نام دے سکتے ہیں جو ان تمام پروگراموں سے مختلف ہوسکتا ہے جن کا عوام سے شاذونادر ہی واسطہ ہوتا ہے جیسے کہ مختلف انڈسٹریز کی مبالغہ آرائی، بڑے لوگوں کی زندگی یا فلمی مرچ مصالحے وغیرہ۔

میڈیا میں ''نیار رحمان'' اور طالبان کی دھمکی

اپریل کے آخری ہفتہ میں سوات میں طالبان نے صحافیوں اور میڈیا سے متعلق دوسرے افراد کو خبردار کیا کہ اگر وہ ''راہ راست'' پر نہ آئے تو انہیں سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اخبارات اور ٹی وی چینلز کے دفاتر کے باہر پوسٹر چسپاں کئے گئے جن میں انہیں دھمکی دی گئی کہ وہ ''طالبان دشمن ایجنڈے'' پر عملدرآمد سے گریز کریں۔ پوسٹروں اور پمفلٹوں میں الزام لگایا گیا کہ گذشتہ ہفتے سے نیار رحمان سامنے آیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی دباؤ کے تحت یا لالچ میں آکر مغرب نواز پالیسی پر عملدرآمد کر رہا ہے۔ میڈیا کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے بیانات کے لئے جگہ اور وقت نکالے جو معاشرے پر برے اثرات ڈالتے ہیں۔ طالبان نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میڈیا نے ان کی ہدایات پر عمل نہ کیا تو انہیں شرعی عدالتوں میں طلب کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ نے طالبان کی اس دھمکی پر تشویش کا اظہار کیا اور ایک بیان میں کہا کہ سوات میں طالبان کی جانب سے دھمکی آمیز خطوط لکھنا اور پوسٹر چسپاں کرنا انسوسناک عمل ہے۔ یہ میڈیا اور صحافیوں کو ڈرانے دھمکانے کے مترادف ہے۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ اگر اس رحمان کو پھلنے پھولنے کی اجازت دی گئی تو پھر تمام غیر ریاستی عناصر اپنے مخصوص نقطہ نظر کو پروجیکٹ کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیں گے۔ اس صورت حال میں میڈیا اپنا وہ رول ادا نہیں کر سکے گا جو آئین کے تحت اسے تفویض کیا گیا ہے۔

طالبان کے دھمکی آمیز پوسٹر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ صرف ایک ہفتہ پہلے تک طالبان کو میڈیا سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ان کے بیانات اور انٹرویوز کو ان کی تسلی کے مطابق جگہ اور وقت دیا جارہا تھا۔ طالبان کو جس نئے رحمان پر تشویش ہوئی وہ صرف ''گزشتہ ہفتے'' سامنے آیا۔ پی ایف یو جے نے طالبان کی دھمکی پر افسوس کیا ہے۔ لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کہا جب طالبان سوات اور دوسرے علاقوں میں شہریوں کے سر قلم کر رہے تھے، ان کی لاشیں چوراہوں پر لٹکا رہے تھے اور میڈیا میں ان کی تسلی کے مطابق رپورٹنگ ہو رہی تھی اور میڈیا کے لوگوں پر ''جہادی صحافیوں'' کی پھبتی کسی جارہی تھی۔ طالبان شاید ''دوستوں'' سے نئے رحمان کی توقع نہیں کر رہے تھے اور انہیں پہلی بار پاکستانی میڈیا کو ذرا سخت الفاظ میں مخاطب کرنا پڑا۔

انتباہ

تمام خبر رساں نجی اور سرکاری نیوز ایجنسیوں کے ایڈیٹروں اور تمام کوریج کرنے والے صحافی اور کالم نگاروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ معاشرے کے رخ موڑنے اور ذہنی انقلاب اور رائے ہموار کرنے میں آپ کا کلیدی کردار ہے۔ لہذا آپ کی اخلاقی، منصبی، ملی، ملکی فرض ہے کہ آپ اپنے ادارت، کالموں اور سرخیوں میں اس بین کو جگہ دیدیجئے جس سے معاشرے میں مثبت نتائج برآمد ہوسکے اور مالاکنڈ ڈویژن کے غیور اور مخلصین مسلمانوں کی امنگوں کی ترجمانی ہوسکے کہ ہمارے دو سالہ جدوجہد خالص نفاذ اسلام کیلئے تھا اس کے علاوہ ہمارہ کوئی ایجنڈا اور نقطہ نظر نہیں ہے لیکن بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمام خبر رساں اداروں کے کوریج اور رپورٹنگ ایک ہفتے سے ایک نئے لب ولہجے سے پیش کر رہا ہیں جس سے ہمیں یہی تاثر ملا کہ شاید کہ آپ مغرب نواز پالیسی پر کسی لالچ یا دباؤ کے تحت گامزن ہوگئے ہیں کہ طالبان نظام عدل اور امن ماحول کو سبوتاژ کر رہے ہیں اور مغربی دنیا کے نظریں ہم پر جمانے کی کوشش کر رہے ہو اگر اس قسم کر توتوں سے باز نہ آئے تو پھر ہم آپ کے خلاف شرعی عدالتوں میں جائیں گے اور آپ اپنی اس گھناؤنی سازش کے جوابدہ اور بھیانک نتائج کے خود ذمہ دار ہونگے۔

از جانب: کمانڈر فدائین شعبہ تحریک طالبان سوات

متاثرینِ باجوڑ اور پولیس میں تصادم

ارشد رضوی

26 مارچ کے اخبارات میں متاثرینِ باجوڑ اور پولیس میں تصادم کی خبریں شائع ہوئیں۔ اس تصادم میں ایک شخص کا خون رزقِ خاک ہوا۔ مجموعی طور پر دونوں طرف سے 17 سے 27 تک لوگوں کے گھائل ہونے کی خبریں اخبارات نے شائع کیں۔ جلوزئی کیمپ کے متاثرین اپنے مطالبات حکام تک پہنچانے کیلئے مظاہرہ کرنے سڑکوں پر نکل آئے تھے کہ پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہوگیا۔ اس تصادم میں انسانوں کے علاوہ سرکاری و پرائیویٹ گاڑیوں اور املاک کا بھی نقصان ہوا۔

متاثرین کے مطالبات جو اخبارات میں شائع ہوئے یہ تھے:

امن بحال کیا جائے۔ شریعت کا نفاذ کیا جائے۔ متاثرہ خاندانوں کیلئے خوراک کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ ہر متاثرہ خاندان کو پانچ لاکھ روپے معاوضہ دیا جائے۔ اور ملٹری آپریشن کے دوران جو لوگ مارے گئے ہیں ان کے لواحقین کیلئے خصوصی پیکیج کا اعلان کیا جائے۔

جلوزئی کیمپ میں مقیم متاثرین کے مطالبات جن کا ذکر اوپر ہوا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ 25 مارچ کا المناک واقعہ اچانک رونما نہیں ہوا۔ کیا ان کے مطالبات کی صدا حکام تک اس واقعے سے پہلے نہیں پہنچی تھی؟ 25 مارچ کے خونیں واقعے کے بارے میں اخبارات نے شہ سُرخیاں تو لگائیں کیا اس سے قبل جلوزئی کیمپ کے مقیموں کے مطالبات و حالات کے بارے میں حکام اور عام لوگ بھی باخبر تھے؟ کیا متاثرین نے اپنے مذکورہ مطالبات کے حق میں اس سے قبل بھی کوئی مظاہرہ یا مارچ وغیرہ کیا تھا؟ یہ لوگ کیمپ میں کیسی زندگی گزار رہے تھے، چھت، روٹی، علاج معالجے کا انتظام کافی و شافی تھا یا بس.....؟ ان کے بچوں کیلئے تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام کیا گیا تھا؟ کیا یہ لوگ واپس اپنے گھروں کو جانا چاہتے ہیں؟ یہ اور ایسے بہت سے سوال و استدلال ہیں جو ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کے بارے میں لوگوں اور حکام کو باخبر رکھنے کا ایک اہم ذریعہ میڈیا ہے۔

ایسی خبریں جو لوگوں کی زندگی میں ہیجان، ڈیپریشن اور مایوسی پیدا کرتی ہیں مگر وہ تلخ حقائق بھی ہوں تو انہیں کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے، یہ بہت اہم اور

متاثرین کے مطالبات جو اخبارات میں شائع ہوئے یہ تھے:

- ☆ امن بحال کیا جائے۔
- ☆ شریعت کا نفاذ کیا جائے۔
- ☆ متاثرہ خاندانوں کیلئے خوراک کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔
- ☆ ہر متاثرہ خاندان کو پانچ لاکھ روپے معاوضہ دیا جائے۔
- ☆ اور ملٹری آپریشن کے دوران جو لوگ مارے گئے ہیں ان کے لواحقین کیلئے خصوصی پیکیج کا اعلان کیا جائے۔

بنیادی نکتہ ہے۔ ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات اگر ایسی خبریں ہی نشر و شائع کریں جن سے معاشرے میں بے چینی، اضطراب اور مایوسی جنم لے تو اس کا ایک نتیجہ زندگی کی مثبت اقدار سے لاتعلقی کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ معاشرتی سطح پر باہمی تعلقات میں ایک بے معنویت پیدا ہوجاتی ہے۔ زندگی کے رنگ پھیکے اور ماند پڑ جاتے ہیں۔ لوگوں کا باہمی اعتماد کمزور ہو جاتا ہے اور لوگ جرائم کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ آپ بھی یہ محسوس کرتے ہونگے کہ آجکل عموماً لوگ یہ بات کرتے ہیں کہ ٹی وی کی نشریات ڈیپریشن کا باعث بنتی جارہی ہیں۔ اس کی یقینی وجہ دہشت گردی، جنگ، خودکش حملوں، طالبان کی کامیابیوں پر مبنی خبریں، تجزیاتی رپورٹیں اور ناک شوز ہیں۔ زندگی ان کے علاوہ بھی ہے اور بہت کچھ ہے۔ لیکن ٹی وی دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے بارود اور خون کے علاوہ پاکستان میں اور کچھ بھی نہیں۔ کیا واقعی یہ سچ ہے، یقیناً صرف یہی سچ نہیں ہے۔

تجزیاتی اور تحقیقاتی رپورٹنگ میں ایک بڑی مشکل جس کا سامنا ہمارے میڈیا کو ہے وہ ''سب سے پہلے.....'' خبر دینے کا ہے۔ بے شک مسابقت کے دور میں زندہ رہنے کیلئے ایسا ہوتا ہے مگر صحافت کی اعلیٰ اقدار کو کس حد تک پامال کیا جاسکتا ہے اور لوگ اس رویّے کو کہاں تک اور کب تک برداشت کریں گے، میڈیا یا مالکان کو اس پر ضرور سوچنا ہوگا ورنہ بات آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔

جنگ ہو یا کوئی اور آفت اچانک وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی۔ ایسے کسی بھی واقعہ کے رونما ہونے سے قبل یا واقع کے رونما ہونے کے علت و اسباب سے خود میڈیا کتنی جانکاری رکھتا ہے۔ اپنے ناظرین و قارئین کو باخبر رکھنا اور جانکاری دینا حقیقی معنوں میں ''خبر'' کہلاتا ہے۔ خبر یہ نہیں ہے کہ سیلاب آگیا ہے، سیلاب کے آنے سے قبل لوگوں کو مطلع کرنا کہ سیلاب کی شدت کیا ہوگی، کن کن علاقوں کو متاثر کرے گا، اس کے بارے میں لوگوں کو قبل از وقت بتانا خبر ہے تاکہ متوقع متاثرہ علاقوں کے لوگ بروقت اپنے لئے حفاظتی انتظامات کرسکیں۔

25 مارچ کا واقع رونما ہونے سے قبل متاثرینِ باجوڑ میں جو بے چینی و بے قراری تھی کیا اس پر کوئی تفصیلی سروے کسی اخبار، ٹی وی یا ریڈیو نے کیا اور حکام کو متاثرین کے مطالبات سے باخبر کرنے کیلئے اس سروے رپورٹ کی نشر و اشاعت کہیں ہوئی تھی؟

فلم ریویو: شوبز

کیمرے کی پاور کو سمجھو!

Use, reuse, misuse and abuse !

BRING BREAKING NEWS

جعفر مہدی

کیمرے کی پاور کو سمجھو! Use , reuse, misuse and abuse ! Bring breaking news

یہ میڈیا کے کردار پر بنائی جانے والی فلم "شوبز" کے ڈائیلاگ ہیں۔

یہ فلم مکیش بھٹ اور مہیش بھٹ کی پیشکش ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں بھائی اکثر اوقات اچھوتے موضوعات پر ہی فلمیں بناتے ہیں، جو عموماً ہمارے سماج کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں بھائیوں کا یہ بھی کمال ہے کہ یہ نئے ٹیلنٹ کو سامنے لاتے ہیں جیسا کہ اس فلم میں، فلم ڈائریکٹر، فلم کے ہیرو اور ہیروئن پہلی بار ان کرداروں کے ساتھ فلم انڈسٹری میں قدم رکھ رہے ہیں۔

میڈیا کے اپنے لوگ ہی کس طرح میڈیا کے کردار اور اقدار کی دھجیاں بکھیرتے ہیں اور میڈیا کی طاقت کو غلط استعمال کرتے ہیں، بھٹ برادران نے بہت خوبصورتی سے اس فلم میں دکھایا ہے۔ میڈیا والے صحافیوں کو اپنی ضرورت کیلئے کس طرح آسمان کی بلندیوں پر پہنچاتے ہیں اور ضرورت پوری ہو جانے پر استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح زمین پر پھینک دیتے ہیں، اس فلم میں بہت کھلے انداز سے دکھایا گیا ہے۔

"دکھنے اور ہونے میں جو فرق ہے اسی پر آج کی صحافت کی دکان چلتی ہے"

راجو خان نے، جو بنیادی طور پر ایک لکھاری ہے، پہلی مرتبہ کسی فلم کو ڈائریکٹ کیا ہے۔ وہ فلم ڈائریکشن میں تو شاید پورے نمبر نہیں لے سکے مگر عزیز خان کے ساتھ مل کر سٹوری اور ڈائیلاگ بہت کمال کے لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلم ریویو کو لکھتے ہوئے بھی بعض ڈائیلاگ کو استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ:

"صحافت نے صحافیوں کو زندہ رکھا ہوا ہے صحافیوں نے صحافت کو نہیں، میڈیا کی طاقت کو سمجھتے ہوئے بھی کچھ صحافی اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔"

فلم کی سٹوری ایک پاپ سنگر کے گرد گھومتی ہے۔ میڈیا والے اپنے منافع کے لئے اس پاپ سنگر کی زندگی میں کیا اتار چڑھاؤ لاتے ہیں، یہ اس فلم کا مرکزی خیال ہے۔ ایک ابھرتے ہوئے فنکار، روہن آریا (توشار جلوٹا) جس کو شوبز اور میڈیا کے بارے میں بہت زیادہ معلوم نہیں آج کا کمرشل میڈیا صرف اپنے منافع کے لئے اس کی زندگی سے کھیلتا ہے اور اسکی زندگی اجیرن بنا دیتا ہے۔ صحافی کی مرضی کے خلاف یا اس کو ناراض کر کے کیسے ایک انسان کی زندگی برباد کی جاتی ہے اور اس پر میڈیا کا کہنا ہوتا ہے کہ

"This is an attack on freedom of media"

فلم کا پہلا حصہ بہت جاندار ہے جس میں فنکار کی حقیقی زندگی کو میڈیا جان بوجھ کر نہ صرف نظر انداز کرتا ہے بلکہ اپنے مخصوص مفادات کے حصول کی خاطر اسے غلط رنگ دے کر عام آدمی کو وہ تصویر دکھاتا ہے جس کا اس فنکار کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس طرح اس فلم میں سچ کے چہرے پر جھوٹ کا پردہ ڈال کر اس ابھرتے ہوئے فنکار کو الجھانے کی کوشش کا مقصد میڈیا کی طاقت کا برملا اظہار کیا گیا ہے۔ میڈیا، جسے سماج میں ایک مثبت تبدیلی لانے اور سچ کو لوگوں تک پہنچانے کا کام کرنا چاہیے وہ اس کے برعکس زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی خاطر لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتا ہے۔

"ان لوگوں کا کام Moral judgement کرنا نہیں، ان کا کام پراڈکٹ بیچنا ہے۔ پراڈکٹ چاہے گانے سے بکے یا پھر کسی کے خلاف چل رہے پروگرام سے They don't care"

اس کے علاوہ میڈیا کے اندر اپنے کتنے مسائل ہیں اور میڈیا کے لوگ ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لئے کس طرح اپنے اندر بھی ایک دوسرے کو بلیک میل کرتے ہیں، یہ سب کچھ بہت اچھے انداز میں دکھایا گیا ہے۔ میڈیا مالکان زیادہ سے زیادہ نام اور پیسہ کمانے کے لئے صحافیوں کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ صحافت کے مقدس پیشے کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، ڈائریکٹر نے بہت ہنرمندی سے میڈیا کے اس رخ کی تصویر کشی کی ہے۔ جھوٹی اور نقلی سٹوریاں بناتے بناتے آجکل کچھ صحافی بھی 'سٹار' بن جاتے ہیں کیونکہ اس سے ان کو **"زندگیاں بنانے اور بگاڑنے کی طاقت، لوگوں کی سوچ بدلنے کی طاقت اور ٹی وی نام کے ہتھیار کو کبھی بھی، کسی پر بھی چھوڑنے کی طاقت"** مل جاتی ہے۔

فلم کے دوسرے حصے میں ڈائریکٹر راجو خان اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے تھوڑی جلدی کر گئے اور خالصتاً کمرشل انداز میں کہانی کو تیزی سے لپیٹ گئے۔ فلم کے اس حصے میں ڈائریکٹر نے جو کام ہیرو سے لیا ہے وہی کام اگر CID آفیسر سے لے لیتے تو وہ حقیقت کے بھی کافی قریب لگتا اور آفیسر کی موجودگی کا جواز بھی بن جاتا۔ فلم میں ایکٹنگ کا معیار ٹھیک رہا ہے، خاص طور پر شوشانت سنگھ (شرد راجپوت) نے اپنا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا۔ میرنا لیتی (شیکھا) اور توشار جالوٹا (روہن آریا) کو ابھی مزید محنت کرنی پڑے گی۔ فلم کی موسیقی بھی درمیانے درجے کی رہی مگر مجموعی طور پر فلم ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس فلم کے آخری ڈائیلاگ ہیں۔

"میڈیا سوسائٹی سے گند ہٹانے کا کام کرتا ہے مگر میڈیا کا گند کون ہٹائے گا؟ کون ہے جو خبر لینے والوں کی خبر لے گا؟ وقت آ گیا ہے کہ ہم خود اپنے گریبان میں جھانک کے دیکھیں کہ ہمارا دامن کتنا میلا ہو چکا ہے۔"

میڈیا کارکن + عوام = میڈیا ڈیموکریسی

ڈاکٹر اختر رضوی۔(کنوینر سٹیزن میڈیا واچ گروپ، لاہور)

جدید میڈیا ترقی یافتہ انسانی اقدار اور سماج کے بطن سے وجود میں آیا اور اسی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرے گا۔ یہ یقیناً انسانی ترقی سے مشروط ہے۔ جمہوری ذرائع ابلاغ کا نظریہ میڈیا کے ماضی، حال اور مستقبل سے وابستہ ہے۔ کوئی بھی ادارہ اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتا جب تک انسانی سماج اس کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ اس ضرورت کا احساس اگر اکثریت کی جانب سے ہو تو ادارے آفاقی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال میڈیا کے ظہور، تخلیق اور ترقی کے بارے میں درست معلوم ہوتی ہے۔

اطلاعات کی بہم رسانی اور ہر انسان تک سچائی پر مبنی معلومات کو پہنچانا جدید سائنسی دور میں انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے، چونکہ کوئی بھی خبر یا اطلاع مختلف طبقات، اقوام، علاقوں یا مخصوص مفادات کے حامل گروہوں کے مالی، سماجی، طبقاتی، ثقافتی یا سیاسی فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اطلاعات کی ترسیل پر اجارہ داری، ایک عالمی مسئلے کے طور پر طاقت کے ایوانوں پر مسلط گروہوں کے درمیان سخت کھینچا تانی کا شکار ہے۔

جمہوری ذرائع ابلاغ کے تصور کو روبہ عمل دیکھنے کیلئے ضروری ہے کہ میڈیا کی دنیا میں طاقت کے توازن اور اس توازن کے حقیقی فریقوں کو سمجھا جائے۔

مارکیٹ اور منافع پر مبنی موجودہ عالمی سماج مالیاتی سرمائے کے اجارہ داروں کے مفادات کے تحفظ اور ترقی کے اصولوں پر قائم ہے۔ میڈیا کی دنیا بھی اس حقیقت کے اثرات سے باہر نہیں۔ لہٰذا میڈیا کی ترجیحات، تعصبات اور رویوں پر مارکیٹ کی طاقتوں کا گہرا اثر ہے۔

مارکیٹ اکانومی کے ذریعے دولت کا انتقال کمزور طبقات سے طاقتور قوتوں کو صرف اسی صورت ممکن ہوتا ہے جب حکومت اور ریاست کی پالیسی اجتماعی انسانی مفادات کو نظر انداز کر کے مارکیٹ اور منافع کے اصولوں پر تشکیل دی جاتی ہے۔ ریاست اور میڈیا انڈسٹری تیسرے فریق یعنی معاشرے کے عام لوگوں پر جبر و تسلط قائم و برقرار رکھنے کیلئے باہمی مفادات کے تحفظ اور ایک دوسرے کے جائز و ناجائز معاملات پر اتفاق رائے قائم رکھتے ہیں۔

غیر جمہوری میڈیا اور حکمران طبقات کے مفادات اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ عوام تک پہنچنے والی اطلاعات اس طور دی جائیں جن سے ان کا اپنا تسلط نہ صرف قائم رہے بلکہ یہ مزید مضبوط ہو۔ چنانچہ میڈیا اطلاعات کی ترسیل میں اس پہلو کو ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے لہٰذا ایسی اطلاعات جن سے معاشرے کے کمزور طبقات میں گروہ بندی اور تصادم کا اندیشہ ہو ایسے مواد کو زیادہ زور اور موثر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

جمہوری میڈیا کا ایک اہم فریق وہ ادارے اور منظم گروہ ہوتے ہیں جو نہ صرف درست اطلاعات تک رسائی رکھتے ہیں بلکہ عام لوگوں تک اس کی ترسیل کیلئے دستیاب تمام انسانی ذرائع استعمال کرتے ہوئے اول الذکر دو فریقوں کو راہ راست پر لانے کیلئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں جمہوری رویوں کی تاریخ کا مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحافیوں کی مزاحمتی تحریکیں مندرجہ ذیل اقدامات پر عمل پیرا رہی ہیں:

میڈیا کے اداروں میں صحافیوں، کارکنوں اور دوسرے متعلقہ افراد پر مشتمل یونین کا قیام جس کے ذریعے عوام کے بنیادی انسانی حقوق پر مبنی صحافتی ضابطہ اخلاق رائج کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ میڈیا کارکنوں کے جائی، مالی اور پیشہ ورانہ حقوق کا تحفظ اور میڈیا مالکان یا ریاستی مفادات کے تحفظ کیلئے اطلاعات کو مسخ کرنے کی بجائے جمہوری اکثریت کے مطالبات پر مبنی درست اطلاعات کو عوام تک پہنچانا شامل ہے۔

میڈیا سے متعلق اداروں میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دینے والے ماہرین اور کارکنوں کو تربیت فراہم کرنا تاکہ ان کی استعداد کار میں اضافہ ہو۔

عوام میں شہری سطح پر ایسے سماجی گروپ تشکیل دینا جو میڈیا سے فراہم کی جانے والی اطلاعات کا عوامی مفاد کی نظر سے بغور جائزہ لے، اور اس پر عوامی اکثریت کے سیاسی حق کو استعمال کرتے ہوئے عوامی مفادات کے خلاف یا جھوٹی اطلاعات کے خلاف جمہوری ردعمل کا اظہار کرنا تاکہ میڈیا مالکان اور حکومت کو عوام کے جمہوری حقوق کی پاسداری پر مجبور کیا جا سکے۔

درحقیقت میڈیا ڈیموکریسی براہ راست عوام کا بنیادی جمہوری حق ہے مگر اسے وہی لوگ اور معاشرے حاصل کرتے ہیں جو سچائی پر مبنی اطلاعات تک رسائی کی راہ میں حائل تمام عناصر اور طاقتوں کو نہ صرف پہچانتے، سمجھتے اور نشان دہی کرتے ہیں بلکہ مروجہ عمرانی اصولوں کے مطابق سچ سننے، سچ بولنے، سچ سمجھنے اور سچ کا رواج عام کرنے کیلئے عوام دشمن مافیا کا پُرامن مقابلہ کرتے ہیں۔

ایسا کرنا اس لئے ناگزیر ہے کہ ذاتی، گروہی، طبقاتی اور قومی فیصلے ہی سماج کی آئندہ شکلوں کا تعین کرتے ہیں۔ ہماری آئندہ نسلوں کے تحفظ، ارتقاء اور بقا اور بالادست قوموں کے مقابلے میں زندہ رہنے کا انحصار ہمارے آج کے فیصلوں پر ہے۔ اور یہ فیصلے میسر اطلاعات کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ کیا غلط اور متعصبانہ اطلاعات کی بنیاد پر قومیں درست فیصلے کر سکتی ہیں؟ کیا مشرقی پاکستان کے عوام پر ہونے والے ریاستی مظالم پر پردہ ڈال کر ذرائع ابلاغ ملک کو بچا سکے؟ کیا غریب و بے کس اکثریت کی حقیقی زندگی اور مسائل سے نظریں چُرا کر آج کا میڈیا عوامی انقلاب یا انارکی کا راستہ روک لے گا؟

سچ تو یہ ہے کہ میڈیا ڈیموکریسی صرف میڈیا کارکنوں کا مسئلہ نہیں بلکہ بنیادی طور پر یہ پاکستان کی جمہوری اکثریت کا حساس سماجی مسئلہ ہے۔ اس بارے میں صرف نظر ہماری اپنی اور آنے والی نسلوں کی زندگی پر یقیناً اثر انداز ہوگا۔

الیکٹرانک میڈیا:
پاکستان میں ناامیدی کی ایک وجہ

(بلال قریشی، واشنگٹن ڈی سی)

گذشتہ سال کے آخر میں میرے پاکستان کے ٹرپ کے دوران ایک بار پھر مجھے ملک کے مختلف حصوں میں جانے اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ پاکستان میں لوگ تقریباً ہر چیز کے بارے میں روز بروز منفی اور قنوطی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے شخص کو تلاش کرنا جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں مثبت رائے رکھتا ہو، ناممکن ہو گیا ہے۔ آج پوری دنیا زبردست معاشی بحران سے دوچار ہے۔ اور حکومتیں اس بحران سے نپٹنے کے لئے تگ و دو کر رہی ہیں۔ تاہم مشکل حالات کے باوجود شاید ہی دنیا میں دوسری ایسی قوم ہو جو اس قدر مایوسی کا اظہار کر رہی ہو جیسا کہ پاکستان میں کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں ناامیدی کی ایک وجہ، اور یقیناً یہ واحد وجہ نہیں ہے، الیکٹرانک میڈیا کا رول ہے۔

میڈیا جو عام طور پر دوسرے ملکوں میں حقائق کی صحیح رپورٹنگ کیلئے ذمہ دار ہوتا ہے، پاکستان میں بین الاقوامی معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ پاکستان میں، چند ایک اخبارات چھوڑ کر، پرنٹ میڈیا نے ذمہ داری اور حقیقت نگاری کو جذبات بھڑکانے والی رپورٹنگ اور چیختی چنگھاڑتی سرخیوں پر قربان کر دیا ہے۔ اردو پریس خاص طور پر پبلک کو اس انفارمیشن کی فراہمی کا ذمہ دار ہے جسے خبر کے روپ میں لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ تاہم ملک کے اجتماعی اعتماد (Collective confidence) کیلئے سب سے بڑا خطرہ الیکٹرانک میڈیا ہے۔ جو دن رات ''سازشوں'' اور جذبات انگیز ''بریکنگ نیوز'' پر پھل پھول رہا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ میڈیا کی یہ ذمہ داری ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسے رپورٹ کرے۔ تاہم میڈیا کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ پبلک ان امور کے بارے میں گمراہ نہ ہو جو بہت اہم ہیں یا ملک و قوم کے لئے نازک صورت حال کے حامل ہیں۔ یہ امر انتہائی مایوس کن ہے کہ نام نہاد میڈیا ماہرین، تجزیہ کار، اینکرز اور ٹی وی کی دوسری شخصیات ذمہ داری کے ہر امتحان میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ شاید بالغ نظری کے فقدان کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجودہ ٹی وی اینکرز اور پروڈیوسرز نے کیمرے اور مائیکروفون کے سامنے محدود وقت گزارا ہے۔ شاید یہ اس لئے بھی ہے کیونکہ پاکستان میں لوگوں کی سیاست میں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، پاکستان میں ٹی وی چینلوں سے جس عدم تحفظ، مایوسی اور تباہی و بربادی کا پرچار کیا جا رہا ہے، وہ نا صرف پاکستان کے اندر لوگوں کو غیر محفوظ بنا رہا ہے بلکہ اس تصور کو بھی پھیلا رہا ہے کہ ملک میں ہر چیز ختم ہونے والی ہے۔ (ترجمہ، ویب سائٹ

http://pakistan.foreignpolicyblogs.com/2009/12/02/medias-role-in-todays-pakistan/)

تین بڑے شہروں میں منعقدہ سیمینارز میں

پاکستانی میڈیا کے کردار کا تنقیدی جائزہ

پاکستان میں میڈیا پر لوگوں کا اعتماد بتدریج کم ہو رہا ہے۔ سوسائٹی کے مختلف شعبوں میں میڈیا کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ مختلف اہل نظر میڈیا کے کردار پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور اب عوامی اور فکری فورم پر میڈیا کے کردار کو باقاعدہ طور پر زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ ماہ مارچ میں ملک کے تین بڑے شہروں کراچی، لاہور اور ملتان میں میڈیا پر تین سیمینار ہوئے جن میں میڈیا کے کردار پر روشنی ڈالی گئی۔ سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ، اسلام آباد کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مظہر عارف کو ان تینوں سیمینارز میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

عوامی شعور اور میڈیا

پاکستان فیچرز فورم کے سالانہ کنونشن کے موقع پر 23 مارچ کو ملتان میں ''عوامی شعور اور میڈیا'' کے موضوع پر سیمینار ہوا جس کی صدارت بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر کرامت علی نے کی۔ پاکستان فیچرز فورم کے عہدیداروں نے، جن میں یونیورسٹی، کالجوں اور سکولوں کے سینئر اساتذہ شامل تھے، اخبارات اور خاص طور پر پرائیوٹ ٹی وی چینلز کے پروگراموں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ میڈیا مخصوص مقتدر گروہوں کے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے۔ جبکہ عوام کی بھاری اکثریت کی الجھنیں اور ان کے روز مرہ کے مسائل عمومی طور پر میڈیا کا موضوع نہیں رہے۔ سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ، اسلام آباد کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مظہر عارف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عوامی شعور اور میڈیا کے رول پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انہوں نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ میڈیا شعور اجاگر کرتا ہے یا یہ کہ عوام بے شعور ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میڈیا انفارمیشن تو مہیا کر سکتا ہے، جس پر لوگ اپنے تجزیے خود کرتے ہیں، اور نتیجہ نکالتے ہیں۔ اخبارات اور ٹی وی چینلز پر خبریں انفارمیشن سے زیادہ ڈس انفارمیشن پھیلاتی ہیں، سموک سکرین بناتی ہیں تاکہ لوگ یہ نہ دیکھ سکیں اس سکرین کے پیچھے کیا ہے۔ لوگ تو باشعور ہوتے ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ کہ وہ کتنے چوکس ہیں اور کب عمل کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔

میڈیا اور انتہا پسندی

ایک غیر سرکاری تنظیم ایس پی او کے تحت لاہور میں 25 مارچ کو ملکی حالات کے بارے میں ایک روزہ کانفرنس ہوئی جس میں ملک بھر کے پانچ سو کے قریب مرد و خواتین شریک ہوئے۔ کانفرنس کا پہلا سیشن ملک میں انتہا پسندی کے فروغ اور اس کی وجوہات کے بارے میں تھا۔ اس سیشن میں مظہر عارف نے ''میڈیا اور انتہا پسندی'' کے موضوع پر گفتگو کی۔ ان کے مطابق عالمی سطح پر اب یہ بات زیر بحث ہے کہ میڈیا کا طرز عمل دہشت گردوں کے فروغ کا باعث بن رہا ہے۔ میڈیا کے ادارے دہشت گردوں کو پروپیگنڈا اپورچونٹیز فراہم کر کے ان کے مقاصد کو تقویت دے رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی اینکر پرسنز پر انتہا پسندی کی حمایت کا الزام لگتا رہا ہے۔ عام لوگ ذاتی تجربے کی بجائے میڈیا کے ذریعے حقیقت کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ جب میڈیا کے بڑے ادارے ایک ہی راگ الاپ رہے ہوتے ہیں تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ انہیں ایمانداری سے باخبر رکھا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں کو بعض باتوں پر قائل کرتے ہیں یا اہم انفارمیشن چھپا لیتے ہیں اور حکومتوں کو کسی خاص سمت عمل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پبلسٹی دہشت گردوں کے لئے آکسیجن ہے۔ دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کا بڑا ہدف عوامی ادراک ہے اور میڈیا اس ادراک کو تشکیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پاکستان میں میڈیا میں اس طرح کے خیالات سامنے آتے رہتے ہیں جن میں یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ انتہا پسندوں کا نصب العین منصفانہ ہے اور ان کے پاس تشدد کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ ''سب سے پہلے خبر'' ایک ایسی ناخوشگوار صورت ہے جب میڈیا نہ چاہتے ہوئے بھی دہشت گردی کی پبلسٹی کا باعث بنتا ہے۔

سیاست اور میڈیا: ہم آہنگی کے مسائل

شہید ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (SZABIST) کراچی کے طالبعلموں نے 28 مارچ کو انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں ''سیاست اور میڈیا: ہم آہنگی کے مسائل'' پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت سٹیزنز میڈیا کمیشن آف پاکستان کے چیئرمین اور سابق وزیر اطلاعات جاوید جبار نے کی۔ جبکہ مقررین کے پینل میں سندھ کی وزیر اطلاعات شازیہ مری، سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ، اسلام آباد کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مظہر عارف، ماہنامہ ''ہیرالڈ'' کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ادریس بختیار، ڈان نیوز کی سینئر اینکر پرسن عائشہ محسن اور سما ٹی وی کے اینکر پرسن فیصل قریشی شامل تھے۔ طالب علموں نے سیمینار کے لئے زبردست تیاری کر رکھی تھی۔ اس موقع پر شائع کیے جانے والے آٹھ صفحوں کے بروشر میں طالب علموں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ پاکستان میں سیاست اور میڈیا کے درمیان رابطے اور ہم آہنگی کا فقدان کیوں ہے؟

Most of us would prefer to think that the people who are employed, in effect, to be our ears, eyes and voices, will perform thier task without fear or favour. We expect them to be free of vested interests. However, criticisim is justified when they allow thier personal views to obtrude, tarnishing the impartiality required of broadcasters under statute.

Mike Jempson, Director, MediaWise

ہم میں سے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جن لوگوں کو دراصل ہماری آنکھ، کان اور آواز ہونے کے لئے ملازمت دی گئی ہے، وہ اپنا کام بغیر کسی خوف اور لالچ کے سرانجام دیں گے۔ ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی کے مفاد کے لئے کام نہیں کریں گے۔ البتہ اس وقت تنقید جائز ہو جاتی ہے جب براڈ کاسٹرز اپنے ذاتی خیالات و نظریات پر قابو نہیں رکھ سکتے جن سے ان کی غیر جانبداری مجروح ہوتی ہے، جسے برقرار رکھنے کے لئے وہ قانون کے تحت پابند ہیں۔

مائیک جمپسن، ڈائریکٹر میڈیا وائز

204, 2nd Floor, Kiran Plaza, F-8 Markaz, Islamabad.
Phone: 051-2855011 / 022
email: mediamonitor@alternativemedia.org.pk
website: www.alternativemedia.org.pk

With the Co-opration of: Friedrich Ebert Stiftung